



الرسالہ

Al-Risala

May-June 2026 • Rs. 50



ہر عورت اور مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ
شعوری سطح پر خدا کے دین کو دریافت کرے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الرساله

May-June 2026 | Volume 51 | Issue 3

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr. Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala

1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013

Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: info@goodwordbooks.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 50 per copy
Subscription by Book Post	₹ 250 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 450 per year
Subscription (Abroad)	US \$20 per year

Bank Details

Saniyasnain Khan
State Bank of India

A/c No: 30087163574

IFSC Code: SBIN0009109



To order books by

Maulana Wahiduddin Khan

please contact Goodword Books

Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675

Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

21	اللہ کی قدرت	4	خدا موجود ہے
22	ضروری تیاری کے بغیر	5	تخلیغی منصوبہ
23	خدا کا ذکر	6	قرآن کے ٹکڑے کرنا
27	خدا کی معرفت		داخلی آمدگی کے
28	خدا کا وجود	7	بغیر ہدایت نہیں
29	قدیم و جدید	8	دریافت نہ کہ نفاذ
30	آفاقی نقطہ نظر	9	درخت کلچر
31	علم کی حد	10	کفالت کا انتظام
32	کھلا پن	11	کتاب، حکمت
33	معرفت، معلومات	12	ملی ہوئی چیز، نہ ملی ہوئی چیز
34	کامیابی کا راز	13	پوری زمین مسجد
35	اسٹیج ایکٹورزم کا دور	14	نصاب یا محرک
36	میں اہم تھا	15	اہل کتاب سے سیکھو
37	بڑھاپے کا دور	16	سی پی ایس علماء کو وصیت
38	اسن کا فارمولا	17	قربانی کی صورتیں
39	ڈائری 1986	18	سیرت رسول کا
46	ایک قابل ذکر واقعہ	19	انتہائی مطالعہ
48	خبر نامہ اسلامی مرکز	20	تشبیہ کی ممانعت
			انسان کا المیہ

موت کا پاٹ	1
بुरے برتاؤ سے اچھے نتیجے کی اُمید کرنا	2
एक ही मा'बूद	3
निस्स्वार्थता	4
विश्वास और तवक्कुल	5
कडूरता का कारण असंतोष	6
पूरी धरती मस्जिद बन गई	7
सन्न का हथियार	9
खुदा का जिक्र	11
व्यक्ति के स्तर पर	14
और ताला खुल गया	15

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi

Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301

Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

خدا موجود ہے

امریکی ٹیلی ویژن چینل سی این این (CNN) کی ویب سائٹ پر 31 جنوری 2022 کو ایک رپورٹ شائع ہوئی۔ اس کے مطابق، یو ایس نیشنل اکیڈمی آف سائنسز کے جرنل میں شائع ہونے والی ایک تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ 'درختوں کی اقسام کا تخمینہ لگانا دنیا بھر میں جنگلات کے تحفظ کی کوششوں کو ترجیح دینے کے لیے اہم ہے'۔ اب تک درختوں کی تقریباً 64 ہزار 100 اقسام دریافت کی جا چکی ہیں۔ تاہم تحقیق کے مطابق، زمین پر تقریباً درختوں کی اقسام کی تعداد 73,300 موجود ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اب تک درختوں کی نو ہزار سے زیادہ اقسام کا علم نہیں ہے:

There are more than 9,000 types of trees we don't know of yet, study finds: The study, published in the Proceedings of the National Academy of Sciences, pooled data from around the world to show that there are roughly 73,000 types of trees on Earth, and some 9,200 are unaccounted for. Almost one-third of the undiscovered tree species are likely to be rare with limited dispersion, said the study authors, making them especially vulnerable to climate change. (By Danya Gainor and Angela Dewan, January 31, 2022)

مضمون میں آگے لکھا گیا ہے کہ یہ تحقیق بتاتی ہے کہ فی الواقع ہم اس قیمتی آرگنزم کے بارے میں کتنا کم جانتے ہیں۔ یہ اس بات کو یاد دلاتی ہے کہ ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے:

This research highlights how little we actually know about the magnificent organism and has left researchers wanting to learn more.

یہ دریافت اشارہ کرتی ہے کہ کائنات میں بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں جو ہماری نگاہ سے اوجھل ہیں، مگر وہ موجود ہیں۔ مثلاً بلیک ہول کی دنیا، وغیرہ وغیرہ۔ کائنات میں پھیلے ہوئے بے شمار عجائبات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کا ایک خالق اور انتظام کرنے والا ہے۔ جس طرح درختوں کی بہت سی اقسام کا ہمارے علم سے باہر ہونا اس کا ثبوت نہیں کہ وہ موجود نہیں ہیں، اسی طرح خدا کا ہماری نظروں سے اوجھل ہونا اس کا ثبوت نہیں کہ وہ موجود نہیں ہے۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

تخلیقی منصوبہ

ایک قاری الرسالہ نے یہ سوال لکھا ہے: کریشن پلان آف گاڈ جاننا کیوں ضروری ہے، کیا اس کو جاننے سے انسان کی زندگی کا سفر آسان ہو جائے گا، یا انسان کے اشکالات دور ہو جائیں گے، آخر اس کی اتنی اہمیت الرسالہ مشن میں کیوں ہے؟ (حافظ سید اقبال احمد عمری، عمر آباد، تامل ناڈو)

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال ایک بنیادی سوال ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنا ہر انسان کی ذمے داری ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے آدمی اپنے لیے راہ راست کو پالیتا ہے، اور اگر وہ اس راہ راست کو نہ پائے، تو وہ زندگی کی راہوں میں بھٹکتا رہے گا، وہ اپنے لیے صراطِ مستقیم (right path) کو دریافت نہ کر سکے گا۔

یہ حقیقت قرآن کی اس آیت کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے: **الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ (67:2)**۔ یعنی جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے۔ اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔

قرآن کی اس آیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق سے خالق کا مقصد کیا ہے۔ وہ ہے احسن العمل افراد کا بذریعہ امتحان انتخاب کرنا۔ افراد کو امتحان کے حالات میں ڈال کر یہ دیکھنا کہ لوگوں میں وہ فرد کون سا ہے، جس نے امتحان میں احسن العمل کردار کا ثبوت دیا۔ مثلاً وہ کون ہے جو اصولوں پر قائم رہ کر اپنے ہمسایوں کے لیے قابلِ پیشین گوئی کردار کا حامل بن گیا ہے۔ یعنی اس کے ہمسائیگی میں رہنے والے یہ یقین کر سکتے ہیں کہ اس سے کوئی نزاع پیدا ہو جائے، تو وہ حق کے راستے سے کبھی نہیں ہٹے گا۔ وہ اس اصول کا حامل بنا رہے گا، جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ ءَاٰلَا تَعْدِلُوۡا اَعْدِلُوۡا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (5:8)**۔ یعنی، کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو، یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

یہی وہ منتخب لوگ ہیں، جن کو آخرت کی دنیا میں جنت میں داخلہ ملے گا۔

قرآن کے ٹکڑے کرنا

قرآن کی سورۃ الحجر میں ارشاد ہوا ہے: وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ۝ كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ۝ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ (91-89:15)۔ یعنی، کہو کہ میں ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اس طرح ہم نے تقسیم کرنے والوں پر بھی اتارا تھا، جنہوں نے اپنے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

اس سلسلے میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: أَرَأَيْتَ قَوْلَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ: كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ، مِنَ الْمُقْتَسِمِينَ، قَالَ: الْيَهُودُ، وَالنَّصَارَى. قَالَ: الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ، مَا عِضِينَ؟ قَالَ: آمَنُوا بِبَعْضٍ، وَكَفَرُوا بِبَعْضٍ (المجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 6204)۔ یعنی، قرآن کی اس آیت میں تقسیم کرنے والوں سے مراد کون ہیں، آپ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ۔ پھر اُس آدمی نے پوچھا کہ عِضِينَ کا مطلب کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا۔

اس آیت کا ابتدائی انطباق (application) یہود و نصاریٰ پر ہے۔ جو دور سابق کے اہل کتاب تھے، اور توسیعی اعتبار سے، اس کا انطباق خود امت مسلمہ پر ہے۔ قرآن کو ٹکڑے کرنے کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیتوں کو ان کے انطباق کے اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ قرآن میں جو احکام ہیں اُن کو دوسرے گروہوں اور افراد سے اس طرح متعلق کر دینا کہ خود اپنے آپ سے تعلق رکھنے والی آیتیں بہت کم رہ جائیں۔ مثلاً خیر امت جیسی کچھ آیتوں کو اپنے سے متعلق سمجھنا اور قرآن کی ذمہ داری اور جوابدہی سے متعلق تمام آیتوں کو دوسروں کے خانے میں ڈال دینا۔ جب کوئی امت کتاب الہی کے ساتھ یہ معاملہ کرے تو کتاب الہی اس کے لیے صرف فخر کی ایک کتاب بن جاتی ہے، نہ کہ زندگی کے لیے رہنما کتاب۔ یہی موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا حال ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لیے قرآن صرف ایک قومی فخر کی چیز ہے۔ وہ ان کے لیے زندگی کو گاڈ ٹکڑے کرنے والی کتاب نہیں۔

داخلی آمادگی کے بغیر ہدایت نہیں

قرآن کی سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيَوْمٍ يُمُونُوا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ (6:111)۔ یعنی، اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور ہم ساری چیزیں ان کے سامنے اکٹھا کر دیتے تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہ تھے، الایہ کہ اللہ چاہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔

اس آیت میں إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ (الایہ کہ اللہ چاہے) سے مراد مشیتِ خداوندی نہیں ہے، بلکہ متابعتِ سنتِ الہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس کو کامل آزادی عطا فرمائی ہے۔ اس کے ساتھ انسان کو وہ عقل دی گئی ہے جو باتوں کی حقیقت کو سمجھے اور صحیح اور غلط میں فرق کر سکے۔ یہی انسان کا اصل امتحان ہے۔ جو آدمی اپنی خدا داد عقل کو درست طور پر استعمال نہ کرے، وہ ہدایت سے محروم رہے گا۔

ہدایت کے سلسلے میں اصل چیز یہ نہیں ہے کہ آدمی کو محسوس طور پر تمام حقیقتیں دکھادی جائیں، بلکہ اس معاملے میں اصل فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ آدمی اپنی عقل کو پوری سنجیدگی کے ساتھ درست طور پر استعمال کرے۔ وہ حاصل شدہ ڈاٹا (data) کا تجزیہ کر کے صحیح علم تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ محسوس حقیقتیں خواہ کتنی ہی زیادہ دکھائی جائیں، خواہ سارا عالم حقیقت ان کے لیے کھول دیا جائے، لیکن انسان اگر اپنی عقل کو درست طور پر استعمال نہ کرے تو وہ بدستور اندھا بنا رہے گا۔ وہ حقیقتوں کو دیکھ کر بھی حقیقتوں کا اعتراف نہیں کرے گا۔ ابلیس کا واقعہ اس کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے۔

ابلیس تمام حقیقتوں کو محسوس طور پر دیکھ چکا تھا، لیکن اس کی سرکشی نے اس کو اعترافِ حق سے محروم رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ داخلی آمادگی کے بغیر کسی چیز کا اعتراف ممکن نہیں۔

دریافت نہ کہ نفاذ

گلیڈیو گلیلی (1642-1564ء) کو فادر آف ماڈرن سائنس کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک قول ان الفاظ میں آیا ہے — کسی کو کوئی چیز سکھانا تمہارے بس میں نہیں ہے، تم صرف اس کی مدد کر سکتے ہو کہ وہ اس چیز کو بذاتِ خود دریافت کرے:

You cannot teach a man anything; you can only help him discover it himself.

یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اپنا پیغام پہنچانے کے لیے جو طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا، وہ یہ ہے: **وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا** (4:63)۔ یعنی، اور ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دلوں میں اترنے والی ہو۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ لوگوں سے زور زبردستی اپنی بات نہ منواؤ، بلکہ ان سے ایسی زبان میں خطاب کرو جو ان کے لیے قابلِ فہم ہو اور ان کے ذہن کو ایڈریس کرے۔

اسلام نفاذ (enforcement) کا موضوع نہیں ہے۔ بلکہ وہ انسانی ذہن کو ایڈریس کرنے کا موضوع ہے۔ تاکہ انسان خدائی پیغام کو ڈسکور کر کے خدا کے آگے خود کو سرینڈر کرے۔ قرآن کے مطابق، موجودہ دنیا دارالامتحان (الملک، 2:67) ہے، امتحان کی اسی مصلحت کی بنا پر موجودہ دنیا میں انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ تاکہ وہ اپنے اختیار (choice) سے اس کو مانے یا اس کا انکار کرے۔ قرآن میں ہے: **فَذَكِّرْ إِيَّاهُمْ أَنَّهُمْ آتَتْهُمْ مَذَكِّرًا ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ** (22:88)۔ یعنی، پس تم یاد دہانی کرو، تم بس یاد دہانی کرنے والے ہو۔ تم ان پر داروغہ نہیں۔ قولِ بلیغ میں کلام کرنے سے مخاطب کے اندر سنجیدگی کے ساتھ آپ کی باتوں پر غور و فکر کا ذہن پیدا ہوتا ہے، اس کی غفلت ٹوٹی ہے، اس کے اندر نیا تفکیری عمل (thinking process) جاری ہو جاتا ہے، اور وہ چیزوں پر از سر نو غور کرنے لگتا ہے۔ اس کے اندر ایک نیا مزاج ڈیولپ ہوتا ہے، جس کو قرآن میں معرفت یا عرفانِ حق (5:83) یا ربانی مزاج (3:79) کہا گیا ہے۔ اسی حقیقت کو گلیلیو نے سائنس کے ریفرنس میں سیلف ڈسکوری سے تعبیر کیا ہے۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

درخت کلچر

قرآن میں ایمان کو درخت (25-14:24) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ درخت جس کلچر کو ماڈی ٹو پر اپنائے ہوئے ہے، اس کلچر کو ایک صاحب ایمان شعوری طور پر اختیار کرتا ہے۔ مثلاً درخت مادی قانون کے تحت بیج (seed) سے ترقی کر کے اپنے آپ کو ایک پورا درخت بناتا ہے۔ یہ واقعہ مومن کی زندگی میں اس کے ایمانی شعور کے تحت پیش آتا ہے۔

اس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ انسان جب سانس لیتا ہے تو وہ سانس کے اخراج کے وقت اپنے اندر سے ایک گیس نکالتا ہے، جس کو کاربن ڈائی آکسائیڈ کہا جاتا ہے۔ یہ گیس انسان کے لیے ایک مضر گیس کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن درخت کاربن ڈائی آکسائیڈ لیتا ہے اور آکسیجن چھوڑتا ہے۔ درخت اس چیز کو اپنی غذا بنا لیتا ہے، جس کو انسان نے ایک مضر گیس کے طور پر اپنے اندر سے خارج کیا تھا۔

یہ واقعہ جو درخت کے اندر ایک جبری قانون کے تحت پیش آتا ہے، وہی انسان کو اپنے آزاد ارادے کے تحت کرنا ہے۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ منفی تجربات کو اپنے لیے مثبت غذا بنائے۔ وہ غیر موافق خوراک کو اپنے لیے موافق خوراک میں تبدیل کرے۔

اس کی ایک مثال قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں اہل ایمان کی ایک صفت یہ ہے: **وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ** (42:37)۔ یعنی، مومن کو جب غصہ آتا ہے تو وہ غصہ دلانے والے کو معاف کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن اعلیٰ ذہن کا مالک ہوتا ہے، اگر کسی شخص کی طرف سے اس کو اشتعال انگیز تجربہ پیش آئے تو وہ اپنے ذہنی ارتقا کی بنا پر اس قابل ہوتا ہے کہ اس ناخوشگوار تجربے کو مثبت انداز میں لے، وہ غصہ کو معافی میں کنورٹ کرے، وہ غصہ کو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے استعمال کرے۔ مومن شکایت کی نفسیات سے مکمل طور پر خالی ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مومن اعلیٰ حقیقتوں میں جینے کی بنا پر اس صلاحیت کا مالک ہو جاتا ہے کہ وہ شکایت کے ماحول میں بھی لے شکایت بن کر رہ سکے، لوگوں کے بارے میں اس کی خیر خواہی کبھی ختم نہ ہو۔

کفالت کا انتظام

حضرت مریم بنت عمران کا ذکر قرآن میں تفصیل سے آیا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کے ساتھ خصوصی نصرت کا معاملہ کیا۔ اسی میں سے ایک نصرت وہ ہے جس کے لیے قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: **وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا** (3:37)۔ یعنی زکریا پیغمبر نے حضرت مریم کی کفالت (معاشی ضروریات کا انتظام) کیا۔

قدیم زمانہ زراعت کا زمانہ تھا۔ قدیم زمانے میں وسائل اس کے پاس ہوتے تھے، جس کے پاس زراعت ہو۔ جو شخص اپنی کفالت آپ کرنا چاہتا تھا، وہ بھیڑ بکری پالنے جیسا کام کرتا تھا۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ کے قصہ میں مدین کے شیخ کبیر (القصص، 24-23-28) کا واقعہ بیان ہوا ہے۔

قدیم زمانے کے مقابلے میں موجودہ زمانہ بالکل ایک نیا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں صنعتی انفجار (industrial explosion) کی وجہ سے ایک نیا وسیع تر معاشی نظام وجود میں آیا ہے۔ اس نئے نظام کے تحت ہر شخص کے لیے یہ موقع پیدا ہو گیا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کام کر کے اپنے لیے معاشیات کا انتظام کرے۔ مثلاً بزنس، کمپنی کی ملازمت، آفس کی ملازمت، مختلف قسم کے اداروں کی ملازمت، وغیرہ۔ اسی طرح فری لانسنگ کے بہت سے کمانے کے طریقے وجود میں آئے ہیں۔ آج کل تقریباً ہر شخص اپنے لیے کوئی نہ کوئی روزگار پارہا ہے، جس میں کام کر کے وہ اپنی ضروریات فراہم کرتا ہے، بشرطیکہ اس کے اندر کسی نوعیت کی پروفیشنل صلاحیت موجود ہو۔

یہ آج کے انسان کے لیے شکر کا ایک آئٹم ہے۔ قدیم زمانے میں یہ آئٹم موجود نہ تھا، یا اگر موجود تھا تو بہت زیادہ محدود اعتبار سے۔ موجودہ زمانے میں کامل وسعت کے ساتھ یہ مواقع کھل گئے ہیں۔ اس طرح انسان کی کوششوں کے ذریعہ آج کی دنیا میں شکر خداوندی کا ایک نیا آئٹم پیدا ہوا ہے۔ یہ مختلف قسم کے تاریخی انقلابات کا نتیجہ ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس اعتبار سے اللہ رب العالمین کا شکر کرنا سیکھیں، اور اس طرح اپنے آپ کو مثبت سوچ (positive thinking) والا انسان بنائیں۔

کتاب، حکمت

قرآن میں کتاب اور حکمت کا ذکر پیغمبر اسلام ﷺ کے ریفرنس میں سات مقام پر آیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (2:62)۔ یعنی، وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول انھیں میں سے اٹھایا، وہ ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔ اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

کتاب سے مراد قانون شریعت ہے، اور حکمت سے مراد طریق کار۔ مثلاً نماز کا حکم شریعت سے تعلق رکھتا ہے، اور کعبہ میں بتوں کی موجودگی میں آپ نے کیا رویہ اختیار کیا، اس کا تعلق حکمت سے ہے۔ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، وہ متعین احکام کا نام ہے۔ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ لیکن حکمت شرعی قانون کی طرح ناقابل تغیر نوعیت کی چیز نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے تعلق رکھتا ہے کہ مختلف حالات کے لحاظ سے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس لیے اس کو دوسرے الفاظ میں پریکٹکل وزڈم کہا جاسکتا ہے۔

مثلاً کعبہ میں حج کے مراسم کا تعلق محکم قانون سے ہے۔ اس کے برعکس، کعبہ کو بتوں سے پاک کرنا پریکٹکل وزڈم سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک کعبہ میں حج کے فرائض کی ادائیگی کا تعلق ہے۔ اس میں تغیر کرنا مطلوب نہیں ہے۔ اس کے برعکس، کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کا تعلق پریکٹکل وزڈم سے ہے۔ حالات کے مطابق، جو طریقہ مفید ہو، وہ اختیار کیا جائے گا، اور جس طریقے سے غیر ضروری نزاع پیدا ہو، اس کو ترک کر دیا جائے گا۔ مذہبی اصطلاح میں اس کو بصیرت کہا جاسکتا ہے۔

اس حقیقت کو صحابی رسول عمرو بن العاص (وفات 43ھ) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: لَيْسَ الْعَاقِلُ الَّذِي يَعْرِفُ الْخَيْرَ مِنَ الشَّرِّ، وَلَكِنَّ الْعَاقِلَ الَّذِي يَعْرِفُ خَيْرَ الشَّرِّينِ (المجاسته و جواہر العلم للذہبی، اثنومبر 670)۔ یعنی، عاقل وہ نہیں جو خیر کے مقابلے میں شر کو پہچانے، بلکہ عاقل وہ ہے، جو دو شر کے درمیان کے خیر کو جانے۔

ملی ہوئی چیز، نہ ملی ہوئی چیز

ایک صاحب نے اپنا واقعہ بتایا کہ ان کو یہ تلاش تھی کہ ان کو زندگی میں فل فل مینٹ کیوں نہیں ملتا ہے۔ مثلاً بیوی ویسی نہیں، جیسی وہ چاہتے ہیں، معاشی ضروریات ان کی خواہش کے مطابق نہیں، وغیرہ۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے انھوں نے قرآن کو پڑھنا شروع کیا۔ سورہ ص پڑھتے ہوئے انھوں نے آیت پڑھی: **إِنَّا أَخْلَصْنَا لَهُمْ بَخَالِصَةً ذِي كُرَى الدَّارِ (38:46)**۔ یعنی، ہم نے ان کو ایک خاص بات کے ساتھ مخصوص کیا تھا یعنی آخرت کی یاد دہانی۔

اس کو پڑھتے ہوئے ان کو یہ دریافت ہوئی کہ انبیاء کا اصل مشن تو آخرت کی تیاری ہے، جو کہ انسان کی اصل منزل ہے۔ جب وہ اصل منزل ہے تو موجودہ دنیا میں انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنا کہ ایک مسافر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح ان کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

جو لوگ مایوسی کی زندگی گزارتے ہیں، ان کے حالات کا مطالعہ کیجیے تو ہمیشہ ایک چیز ان کی زندگی میں مشترک طور پر ملے گی، اور وہ یہ کہ ان کی مایوسی کا سبب کوئی بھی ایسی چیز ہوگی جو ان کو زندگی میں نہیں ملی۔ اگر آپ غور کیجیے تو عین اسی وقت ان کو بہت سی چیز ملی ہوئی ہوگی۔ لیکن وہ ملی ہوئی چیز کو بھول جائیں گے، اور نہ ملی ہوئی چیز کو بہت زیادہ یاد رکھیں گے۔ اگر آدمی ایسا کرے کہ وہ ملی ہوئی چیز کو ڈسکور کرے، اور اس کو اپنے زندہ حافظے کا جزء بنائے تو وہ پائے گا کہ اس کے اندر جو مایوسی تھی، وہ بے سبب تھی۔ یہ علامت اتنی زیادہ عام ہے کہ تقریباً ہر شخص اس میں مبتلا نظر آتا ہے۔

اگر آدمی اپنی زندگی کا جائزہ لے اور اپنے ملے ہوئے کو دریافت کر کے اس کے ساتھ جینا شروع کر دے تو یقیناً وہ مایوس انسان کے بجائے پر امید زندگی گزارنا شروع کر دے گا۔ لوگ عام طور پر غلط مطالعے کا شکار رہتے ہیں۔ اگر وہ زندگی کا صحیح مطالعہ کریں تو یقیناً ایسا ہوگا کہ اس کی مایوسی امید میں بدل جائے گی۔ وہ منفی سوچ میں جینے کے بجائے مثبت سوچ کے ساتھ جینے لگے گا۔ وہ تخریب کے بجائے تعمیر کی اصطلاحوں میں سوچے گا۔

پوری زمین مسجد

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ مسند احمد (حدیث نمبر 22137) کے الفاظ یہ ہیں: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ پوری زمین کو میرے لیے اور میری امت کے لیے مسجد اور پاک بنا دیا گیا ہے (وَجُعِلَتِ الْأَرْضُ كُلُّهَا لِي وَلَا مَتِي مَسْجِدًا وَطَهُورًا)۔ اس حدیث میں یہ خوش خبری ہے کہ آنے والا دور عالمی اظہارِ دین کا دور ہے۔ ایک وقت آنے والا ہے، جب کہ پوری زمین امت کے لیے دائرہ کار بن جائے گی۔ ان کے لیے پوری دنیا میں اسی طرح پر امن طریقے سے خدائی مشن کا کام کرنا ممکن ہوگا، جیسے کہ وہ مسجد میں پرسکون طریقے سے عبادت کا کام انجام دیتے ہیں۔ اس روایت میں مسجد صرف مقامِ سجدہ کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وسیع تر معنی میں ہے۔ یعنی پوری دنیا آپ کے لیے مواقع کی دنیا بنادی گئی ہے۔ اب شکایت نہیں کرنا ہے، بلکہ مواقع کو تلاش کر کے اپنا کام کرنا ہے۔ پوری انسانیت کو خدا کے پیغام سے آگاہ کرنے کا کام کرو۔

اسی طرح اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امت کا مشن مکمل طور پر ایک پیس فل (peaceful) دعوہ مشن ہے، جیسے کوئی مسجد میں پر امن طریقے سے عبادت کا کام کرتا ہے۔ پیس فل دعوہ ورک کرنے والوں کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ سارے عالم کو اپنا ورک پلیس (workplace) بنائے۔

دوسرے الفاظ میں یہ حدیث دورِ جدید کی پیشین گوئی ہے۔ یہی وہ دورِ جدید ہے جس میں انسانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور دوسروں کو اس سے باخبر کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ اور یہ اس کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔ قدیم دورِ مذہبی جبر کا دور تھا۔ اس دور میں کسی انسان کو نہ اپنی چوائس (choice) کے مذہب پر عمل کی آزادی تھی، اور نہ ہی وہ اس کی تبلیغ کر سکتا تھا۔ دورِ جدید تمام تر اہل مغرب کی دین ہے، حدیث کی کتابوں میں ایک روایت آئی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم بھی اسلام کی تائید کا کام کریں گے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: إِنَّ اللَّهَ جَلَّ وَعَزَّ لَيَوْبِدُ الْإِسْلَامَ بِرِجَالٍ مِّنْ أَهْلِهِ (الْعَمُّ الْكَلْبِيُّ لِلطَّبْرَانِيِّ، حدیث نمبر 14640)۔ یعنی، بے شک اللہ تعالیٰ اسلام کی تائید ان لوگوں کے ذریعے کرے گا، جو اہل (دین) میں سے نہ ہوں گے۔

دور جدید حقیقت میں دور دعوت ہے جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے دور انسانیت ہے، یعنی داعی تمام انسانوں کے لئے ایک طرفہ طور پر خیر خواہ ہوتا ہے۔ اب داعی کی پلاننگ یونیورسل پلاننگ ہونی چاہیے۔ شرط صرف یہ ہے کہ داعی کے دل میں بالکل بھی منفی سوچ (negativity) نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارا آؤٹ لک یونیورسل آؤٹ لک ہونا چاہیے۔ پوری دنیا ہمارے لیے مدعو ہے، اور ہم پوری دنیا کے لیے داعی ہیں۔ ایک مرتبہ پیغمبر اسلام نے کہا تھا: كَلِمَةٌ وَاحِدَةٌ تُعْطُونَ بِهَا تَمْلِكُونَ بِهَا الْعَرْبَ، وَتَدِينُ لَكُمْ بِهَا الْعَجَمَ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 417)۔ یعنی، ایک کلمہ جو تم قبول کرو گے، اس کے ذریعے تم عرب پر غلبہ حاصل کر لو گے، اور تم تمہارے آگے جھک جائیں گے۔

یہ گویا اہل اسلام کے لیے رہنمائی ہے کہ آنے والے دور میں ان کو کیا کام کرنا ہے۔ وہ کام ہے پوری دنیا میں توحید کا کلمہ یعنی توحید کی آئیڈیالوجی کو پہنچانا۔ اوپر مذکور مسجد والی حدیث کو رسول اللہ کے اس دوسرے قول کے ساتھ ملایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب ساری دنیا میں اہل ایمان کو دین پر عمل کرنے اور دین کی دعوت دینے کی آزادی ہوگی تو امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس دور کو اپنے لیے خدا کا عطیہ سمجھیں، اور پر امن طریقے سے ساری دنیا میں توحید کا کلمہ پہنچائیں۔

نصاب یا محرک

اعلیٰ تعلیم کے لیے صرف نصاب کافی نہیں ہے، بلکہ کمپنیشن کا ماحول انتہائی ضروری ہے۔ اصل یہ ہے کہ کسی بھی میدان میں ترقی کے لیے محرک (motivation) درکار ہوتا ہے۔ کمپنیشن کا ماڈل ماٹیو پیٹنگ ماڈل (motivating model) ہے۔ مگر مسلم قوم کے اندر جن لوگوں نے تعلیم کے میدان میں کام کیا، انہوں نے زیادہ تر نصاب بنانے پر زور دیا، کمپنیشن کو نظر انداز کر دیا۔ اس لیے مسلم قائدین تعلیم تعلیم کہتے رہتے ہیں، مگر مسلم قوم کو عملاً کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اہل کتاب سے سیکھو

بیسویں صدی عیسوی مسلم سرگرمیوں کی صدی تھی۔ مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے لیڈر اس صدی میں پیدا ہوئے۔ لیکن نتیجے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یقیناً مسلمانوں نے اس صدی میں صرف کھویا ہے، پایا کچھ بھی نہیں۔ اس کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب صرف ایک تھا— کنڈیشنڈ سوچ کے تحت اپنے اقدامات کی منصوبہ بندی کرنا۔ یعنی مسلمانوں کے اندر سیاسی ناکامیوں کے نتیجے میں یہ مفروضہ سوچ پیدا ہو گئی کہ امت مسلمہ کے باہر کوئی ان کا خیر خواہ نہیں ہے، تمام لوگ ان کے اور ان کے دین کے دشمن ہیں، وہ ان کے خلاف سازش کرنے والے ہیں۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ اپنی کنڈیشننگ کی وجہ سے امت نے اہل مغرب اور ان کے ذریعے وجود میں آنے والی جدید تہذیب یعنی سائنسی تہذیب کو ایک دشمن تہذیب یا سازش سمجھا۔ اس بنا پر وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہے۔ کسی قوم کی کوشش اسی وقت نتیجہ خیز ہوتی ہے، جب کہ وہ زمانی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر کی جائے۔ مگر مسلمانوں کی کوششیں زمانی تقاضوں کے مطابق نہ تھیں، اس لیے وہ ناکام رہیں۔ مثلاً یہ کہ قدیم ٹرائبل ایج میں ملٹری قوت کی بنیاد پر کامیابی ملتی تھی، مگر جدید دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کی بنیاد پر قومیں ترقی کر رہی ہیں، وغیرہ۔ امت مسلمہ اپنی کنڈیشنڈ سوچ کی بنا پر اس زمانی تبدیلی کو سمجھنے میں ناکام رہی۔ چنانچہ ان کی ساری کوششیں بے شمار جانی اور مالی قربانیوں کے باوجود بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔

قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ سوچ درست سوچ نہ تھی کہ اہل کتاب سے علم اور تجربے کی سطح پر استفادہ نہ کیا جائے۔ مثلاً قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: **فَاسْأَلُوا أَهْلَ الدِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (16:43)**۔ یعنی، اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک اہل ذکر سے مراد اہل کتاب ہیں۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ لرننگ کے لیے امت کا دائرہ کیا ہے۔ امت کے لیے لرننگ کا دائرہ امت کے باہر کے افراد بھی ہیں۔ یعنی قرآن کے نزول کے بعد وہ دور اب ختم ہو گیا کہ آپ یہ سوچیں کہ تعارف اسلام کے لیے کس کے علم اور

تجربے اور کس پلیٹ فارم کو استعمال کریں، اور کس کو نہیں۔ آنے والا دور یونیورسل آؤٹ لک کا دور ہے۔ اب ساری دنیا مشترک طور پر ہر ایک کا پلیٹ فارم ہے۔ آپ اگر پیس فل اور پارٹیو انداز اختیار کریں تو ساری دنیا آپ ہی کا پلیٹ فارم ہے۔

دور جدید میں اہل کتاب کون لوگ ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو سائنسی تہذیب کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ڈائسپورا میں بھیجے گئے۔ ڈائسپورا میں بھیجنے کا مقصد کنڈیشننگ توڑنا تھا۔ جدید دور اسی ڈی کنڈیشننگ کا نتیجہ ہے۔ اب اہل ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ خدا کے منصوبے کو دریافت کریں، اور اس میں اپنے آپ کو لگانے کے لیے دوڑ پڑیں۔ وہ خدا کے مشن کو کامیابی کے ساتھ گلوبل لیول پر جاری کرنے کے لیے اہل کتاب کے ڈسکورڈ علم اور تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔

سی پی ایس علما کو وصیت

میرے مرنے کے بعد آپ کو میری چرچا نہیں کرنی ہے، بلکہ میرے چھوڑے ہوئے دعوتی مشن کو آگے بڑھانا ہے۔ میرا مشن کیا ہے۔ شخصیت کو چھوڑو، عظمت خداوندی کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ حدیث میں ہے: لَا تُطْرُقُونِي كَمَا أَطْرَقَتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3445)۔ یعنی میرا بیان بڑھا چڑھا کر نہ کرو، جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کا بیان کیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کی چرچا میں نہیں لگنا چاہیے۔ جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر نے ایک وفد ایک قوم کی طرف بھیجا تو ان سے کہا کہ ان کو حدیث نہ سنانا، کیوں کہ وہ قرآن میں مصروف ہیں: إِنَّكُمْ تَأْتُونَ أَهْلَ قَرْيَةٍ لَهُمْ دَوِيٌّ بِالْقُرْآنِ كَدَوِيِّ النَّخْلِ، فَلَا تَصُدُّوهُمْ بِلَا أَحَادِيثٍ، فَتَشْغَلُوهُمْ (شرح مشکل الآثار، اثر نمبر 6049)۔ اس کو منکرین حدیث، حدیث رسول کے انکار کے لیے بطور استدلال پیش کرتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ حضرت عمر کے قول کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ خدا کے چرچے میں ہیں، تم ان کو رسول کے چرچے میں مصروف نہ کرو۔ یہی میری وصیت اپنی ذات کے لیے ہے۔ (بحوالہ ڈائری مولانا خطیب اسرار الحسن عمری، تامل ناڈو، 31 جنوری 2012)

قربانی کی صورتیں

ایک قربانی یہ ہے کہ آدمی مال کا نقصان اٹھائے، اور جسمانی تکلیف کو برداشت کرے۔ اس سے زیادہ بڑی قربانی وہ ہے، جب کہ مومن دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی خواہشات پر روک لگائے۔ اسی لیے قرآن میں ان لوگوں کے لیے جنت کا اعلان ہے جنہوں نے اپنے نفس کو خواہش سے روکا: **وَتَمَّتْ سَعْيُهُنَّ مِنَ الْفُتُورِ عَنِ الْهَوَىٰ (79:40)**۔ خواہشات پر روک لگانے کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان اپنی ضرورتوں میں کمی کو برداشت کرے۔ اگر اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کو ترجیح دی جا رہی ہو، تو وہ اس کو پورے دل کی آمادگی کے ساتھ قبول کر لے۔ وہ زیادہ کام کرے، اور اس کے بدلے میں اس کو کم دیا جائے، تو وہ اس پر راضی ہو جائے۔ اس کی قربانیوں کا تذکرہ نہ ہو، جب کہ دوسرے کی قربانیوں کا خوب تذکرہ ہو، مگر وہ اس پر خوشی کے ساتھ راضی ہو جائے، وغیرہ۔

صبر کے مواقع صرف جنگ کے میدان میں نہیں ہوتے، بلکہ امن کے میدان میں اس سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ بلکہ موجودہ زمانے میں جنگ کے میدان میں صبر کی نوبت ہی نہیں آتی۔ موجودہ زمانہ ایک بدلا ہوا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں صبر کے مواقع زیادہ تر امن کے حالات میں پیش آتے ہیں۔ اس لیے اس انعام کو پانے کے مواقع جنگ کے میدان کے بجائے امن کے میدان کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔

کسی نے کہا ہے کہ سب سے بڑی قربانی رائے کی قربانی ہے۔ آپ جوش و خروش کے ساتھ ایک رائے پیش کریں، لیکن آپ کی رائے کو نظر انداز کر دیا جائے، اور کسی دوسرے کی رائے کو قبول کر لیا جائے۔ آپ نے اپنے خیال سے ایک بڑا کام کیا ہو، لیکن ایسے شخص کو بڑا انعام دے دیا جائے، جس نے آپ کے نزدیک کوئی بڑا کام نہ کیا ہو۔ اس طرح کے مواقع پر جو قربانی دی جائے، وہ زیادہ تر جذبات کی قربانی ہوتی ہے۔ لیکن جذبات کی قربانی کو برداشت کرنا، جسمانی قربانی سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔

سیرتِ رسول کا انطباقی مطالعہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلو ہیں اور ان مختلف پہلوؤں پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن میرے علم کے مطابق، ایک پہلو ایسا ہے جس پر غالباً کوئی قابل ذکر کتاب نہیں لکھی گئی اور وہ ہے سیرت رسول کا انطباقی مطالعہ (applied study of seerah)۔ یعنی سیرت رسول کے موضوع پر ایسی کتاب جو آج کے ذہن کو ایڈریس کرے، اور آج کا انسان محسوس کرے کہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں وہ رہنمائی موجود ہے جس کی عہد حاضر کو ضرورت ہے۔

مثال کے طور پر محمد حسین ہیکل (1888-1956) نے سیرت رسول پر عربی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے، حیاۃ محمد (طباعت اول 1935، 502 صفحات)۔ اس کتاب کا تقریباً نصف حصہ وہ ہے جس میں مصنف نے سیرت رسول کے بارے میں مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ سیرت نگاری کا یہ انداز کسی اعتبار سے مفید ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ جدید تقاضوں کو سمجھا جائے اور سیرت پر ایسی کتاب لکھی جائے جو جدید ذہن کو ایڈریس کرنے والی ہو۔

مثال کے طور پر اگر ایک مصنف بدر اور احد کے جنگی واقعات کی تفصیل بیان کرے تو آج کا انسان ان کو پڑھ کر زیادہ متاثر نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس، اگر یہ بتایا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے کس طرح پر امن انداز میں تبلیغ کی، کس طرح کلکراؤ کے طریقے سے اعراض کیا اور کس طرح حدیبیہ کے معاہدہ امن جیسی تدبیروں کے ذریعے عرب میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا، جو عملاً غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) کے ہم معنی تھا تو یہ طریقہ آج کے ذہن کو زیادہ اپیل کرے گا۔

آج کے انسان کی سب سے اہم ضرورت کیا ہے۔ آج کے انسان کو ایسی آئیڈیالوجی کی تلاش ہے جو اس کو ذہنی سکون (peace of mind) عطا کرنے والی ہو۔ آج کے انسان کو ایسے طریق کار کی تلاش ہے جو مکمل طور پر امن کے اصول پر مبنی ہو۔ آج کے انسان کو ایسے اجتماعی اصول کی ضرورت ہے جو سماج کے مختلف طبقات کے درمیان امن قائم کرنے والا ہو۔

تشبہ کی ممانعت

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تشبہ کی ممانعت کرتے ہوئے فرمایا: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 4031)۔ یعنی، جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ انہی میں سے ہے۔

اس حدیث کے حوالے سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تشبہ بالکفار مطلقاً حرام ہے۔ مگر مذکورہ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ اس حدیث میں جس چیز سے منع کیا گیا ہے، وہ عمومی مشابہت نہیں ہے۔ اس سے مراد صرف وہ چیز ہے جس کو مذہبی شعار (religious symbol) کہا جاتا ہے۔ مثلاً مسیحی لوگوں کا گلے میں صلیب لٹکانا یا ہندو لوگوں کا سر پر چوٹی رکھنا۔ اس حدیث میں اس قسم کی کچھ محدود چیزوں کو استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ اس حدیث سے عمومی تشبہ کا مفہوم نکالنا بلاشبہ غلو کی حیثیت رکھتا ہے اور غلو سے اسلام میں منع کیا گیا ہے۔

اس غلو کی بنا پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں ایک چیز پیدا ہوئی ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ بطور خود لوگ اس کو اسلامی شناخت (Islamic identity) کہتے ہیں۔ لیکن کوئی ظاہری چیز اسلام کی شناخت نہیں۔ اسلام کی شناخت اسلامی اخلاق اور اسلامی اقدار (Islamic values) ہیں، نہ کہ کوئی ظاہری چیز۔ ظاہری چیزوں کا تعلق کلچر سے ہے اور کلچر ہمیشہ مختلف ہوتا ہے۔ کوئی مخصوص کلچر کبھی اسلام کی شناخت نہیں بن سکتا۔

کلچر کے معاملے میں عدم مشابہت پر زور دینا ایک شدید نقصان کی قیمت پر ہوتا ہے، وہ یہ کہ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صرف ظاہری چیزوں کے اہتمام ہی کا نام اسلامی زندگی ہے، حالانکہ اسلامی زندگی یہ ہے کہ اسپرٹ کے اعتبار سے بھی اسلام کا اتباع کیا جائے، مزید یہ کہ اس نظریے کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر ”ہم اور وہ“ (we and they) کا تصور پیدا ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ دعوت الی اللہ کے نام سے غفلت ہے۔ ایسے معاشرے میں لوگ ملٹی کام کو کام سمجھیں گے اور عمومی دعوت کے کام سے غافل ہو جائیں گے۔

انسان کا المیہ

قرآن کی سورہ الرعد میں زندگی کی ایک حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:
 اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَتَذَكَّرُنَّ الْقُلُوْبُ (13:28)۔ یعنی، آگاہ، اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو
 اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اس آیت پر غور کرنے سے نہایت اہم بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کو اس طرح بیان کیا جاسکتا
 ہے کہ۔ اس دنیا میں حقیقی اطمینان صرف ان لوگوں کو ملتا ہے۔ جو اللہ کے تخلیقی پلان پر راضی ہو جائیں:
 Contentment in this world is only for those who
 willingly accept the creation plan of God.

انسان کی زندگی کو اس کے خالق نے دو دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ موجودہ دنیا کی زندگی، اور
 آخرت کی زندگی۔ موجودہ دنیا عارضی طور پر امتحان کے مقصد کے تحت بنائی گئی ہے، اور آخرت کی دنیا
 وہ ہے جہاں انسان اپنے عمل کا ابدی انعام پائے گا۔ جنت کا معیاری مقام صرف آخرت میں قابل
 حصول ہے، موجودہ دنیا میں نہیں۔

پوری تاریخ کا تجربہ ہے کہ انسان موجودہ دنیا ہی کو اصل سمجھ کر یہاں اپنی جنت تعمیر کرنا چاہتا
 ہے، مگر موجودہ دور حیات میں جنت کی معیاری دنیا قابل حصول نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر آدمی
 احساس ناکامی میں جیتا ہے اور مایوسی کی حالت میں مر جاتا ہے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ تقریباً تمام عورت اور مرد منفی ذہن میں مبتلا رہتے ہیں، خواہ وہ عالم ہوں یا
 جاہل، امیر ہوں یا غریب ہوں، ہر ایک کی شخصیت منفی شخصیت بنی ہوئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ
 ہر انسان آئیڈیل (ideal) کی تلاش میں ہے، جب کہ موجودہ دنیا میں جو چیز اس کو ملتی ہے، وہ
 آئیڈیل سے کم (less than ideal) ہوتی ہے۔ یہ فطرت کا لازمی قانون ہے۔ فطرت کے اس
 قانون کو جاننے ہی کا نتیجہ اطمینان ہے، اور فطرت کے اس قانون سے بے خبری کا نتیجہ
 بے اطمینانی۔ یہی ایک جملے میں ساری انسانی تاریخ کی کہانی ہے۔

اللہ کی قدرت

قرآن میں اللہ کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے (إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ)۔ یہ آیت معمولی لفظی فرق کے ساتھ قرآن میں تقریباً 40 بار آئی ہے۔ یہاں یہ سوال ہے کہ اللہ کی قدرت سے کیا مراد ہے۔ اللہ کی قدرت محدود ہے یا لامحدود۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی قدرت بلاشبہ لامحدود ہے۔ لیکن اس معاملے کو سمجھنے کے لیے یہاں ہمیں اس معروف اصول کو منطبق کرنا چاہیے جس کو التمییز بین الشیئین (principle of differentiation) کہا جاتا ہے، یعنی قدرت اور استعمال قدرت میں فرق کرنا۔ اللہ تعالیٰ بلاشبہ لامحدود قدرت رکھتا ہے، لیکن وہ اس قدرت کا استعمال خود اپنے قائم کردہ اصول کے مطابق کرتا ہے۔

اس اصول کی طرف اشارہ خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی سورہ الانعام میں ارشاد ہوا ہے: كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:54)۔ یعنی کامل قدرت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی قدرت کا استعمال رحمت کے اصول کے تحت کرے گا۔ اس کی ایک معلوم مثال یہ ہے کہ یہ باپ اپنے چھوٹے بچے کو مار ڈالنے پر قادر ہوتا ہے، لیکن اس کی محبت پدری اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کو ہلاک کرے۔

اس معاملے کا دوسرا پہلو وہ ہے جو اللہ اور انسان کی نسبت سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی جب اللہ ہر چیز پر قادر ہے تو انسانی اختیار کا درجہ کیا ہے۔ اس سوال کا وہی جواب صحیح ہے۔ جو متکلمین کی اس جماعت نے دیا ہے، جن کو وسطیہ کہا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو موجودہ دنیا میں امتحان کی مصلحت کی بنا پر پوری آزادی دی ہے، لیکن یہ آزادی صرف اپنے ذاتی ارادے کی حد تک ہے۔ اپنے ذاتی ارادے کے باہر وہ جو کچھ کرتا ہے، وہ خدا کی اسی دنیا میں کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی ارادے کے اعتبار سے آزاد ہے، لیکن وہ اپنی کارکردگی کے لیے مجبور ہے کہ وہ خدا کے پیدا کیے ہوئے انفراسٹرکچر (infrastructure) کو استعمال کرے۔ کیونکہ وہ اس کا بدل پیدا نہیں کر سکتا۔

ضروری تیاری کے بغیر

کوئی انسان، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس دنیا میں آتا ہے تو فطری طور پر اس کے لیے یہاں لامحدود امکان (unlimited potential) موجود ہوتا ہے۔ مگر دنیا کے فطری قانون کے مطابق، یہاں منصوبہ بندی اور ضروری تیاری کے بغیر کامیابی نہیں ملتی۔ کیوں کہ یہاں ہر چیز آپ کو پونشل (potential) کی صورت میں ملتی ہے۔

آپ کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ آپ اس پونشل کو دریافت کریں، اور پونشل کو ذاتی عمل سے اپنے لیے ایکچول (actual) بنائیں۔ مثلاً درخت کا پھل آپ کو خود سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ آپ کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ زرخیہ زمین (soil) میں ایک پودا لگائیں۔ صبر کے ساتھ اس کی نگہداشت کرتے ہوئے اس کو اگانا شروع کریں۔ اس طرح وہ وقت آتا ہے، جب کہ پودا ایک مکمل درخت بن جائے، اور اپنا پھل آپ کو دینا شروع کرے۔ اسی طرح انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اقدام سے پہلے گہرے مطالعے کے ذریعہ مواقع کو دریافت کرے اور پھر دانش مندانہ منصوبہ بندی کے ذریعے اس کو استعمال (avail) کرے۔

یہی فطری اصول فرد اور گروہ کی کامیابی کے لیے یکساں طور پر مطلوب ہے۔ انسان کے لیے اس دنیا میں موافق زمین (opportunity) کی کوئی کمی نہیں ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اس کے لیے ضروری تیاری کی جائے۔ تیاری کے بغیر مواقع کو پانا ممکن نہیں۔ ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان صبر اور مثبت سوچ کی روش اختیار کرے۔ اس میں ادنیٰ درجے کا ڈسٹرکشن (distraction) انسان کو کامیابی سے دور کر دیتا ہے۔ وہ امکان کے قریب پہنچ کر بھی امکان سے دور ہو جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ اسی طریقے کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ کو ہر اعتبار سے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس طریقے کو، دوسرے لفظوں میں، حکیمانہ طریق کار کہا جاسکتا ہے۔

خدا کا ذکر

30 اپریل تا 2 مئی 1984 میں گوئڈہ میں تھا۔ وہاں میرا قیام جناب عبدالمحیط خاں صاحب کے یہاں تھا جو گورنمنٹ پالی ٹیکنک میں پرنسپل ہیں۔ شہر کے باہر تقریباً 165 ایکڑ کے رقبہ میں ایک الگ تھلگ دنیا ہے جو درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ دہلی کے ہنگاموں سے نکل کر اچانک 30 اپریل کی صبح کو میں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں قدرت کے سکون کو صرف چڑیوں کے چہچہے توڑتے تھے۔ جہاں انسانی مصنوعات سے زیادہ خدائی مصنوعات دکھائی دیتی تھیں۔ رات کو لان میں چار پائی کے اوپر لیٹا تو کھلے آسمان کا وہ منظر دکھائی دیا جس میں خدا کے سوا کسی اور کا جلوہ شامل نہیں تھا۔ کھلا ہوا آسمان جس میں ستارے جگمگا رہے ہوں، ایک ایسا منظر ہوتا ہے جو خدا کی عظمت کا زندہ اعلان بن جاتا ہے۔

میں آسمان کے مہیب منظر میں کھویا ہوا تھا کہ ایک روشن چیز ایک طرف سے دوسری طرف جاتی ہوئی نظر آئی۔ یہ بظاہر غیر متحرک ستاروں کے درمیان ایک متحرک ستارہ تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ انسانی ساخت کا سیارہ ہے جو سورج کی روشنی پڑنے سے چمک رہا ہے۔ آجکل مختلف ممالک نے سیکڑوں کی تعداد میں اپنے خلائی سیارے اوپر بھیج رکھے ہیں جو مسلسل زمین کے گرد گھومتے رہتے ہیں اور رات کے مختلف حصوں میں دیکھنے والوں کو نظر آتے ہیں۔ یہ مصنوعی سیارہ دیکھنے میں ایک روشن ستارہ تھا۔ دوسرے تارے بظاہر ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ تیزی سے ایک طرف سے دوسری طرف کو چلا جا رہا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمان کے ستارے اس سے کہیں زیادہ روشن ہیں اور کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ گردش کر رہے ہیں۔

اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ ستارے ٹھہرے ہوئے نظر آتے ہیں اور مصنوعی سیارے متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ستارے بہت زیادہ دور ہیں اور مصنوعی سیارہ بہت زیادہ قریب۔ نیز یہ کہ ستاروں کی روشنی ان کی اپنی روشنی ہے اور مصنوعی سیارہ کی روشنی صرف سورج کی روشنی — اگر سوچنے والی عقل نہ ہو تو صرف دیکھنے والی آنکھ آدمی کو کتنی بڑی غلطی میں مبتلا کر سکتی ہے۔

کائنات خدا کی جلوہ گاہ ہے۔ آدمی اس کے اندر سفر کرتا ہے مگر اس کے سفر میں اور مصنوعی سیارہ کے سفر میں کوئی فرق نہیں۔ انسان خدا کی دنیا میں اپنے صبح و شام پتا تا ہے مگر خدا سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی میں کوئی ایسا موڑ نہیں آتا جب کہ خدا سے اس کا سامنا ہو اور وہ اس سے باتیں کرے۔ خدا کی تجلیوں میں سے کسی تجلی سے اس کی نظر نہیں ٹکراتی جو اس کو تڑپائے اور اس کو اشک بار کر دے۔

یکم مئی کا سورج طلوع ہوا اور ہرے بھرے درختوں پر اس کی سنہری کرنیں پڑیں تو درخت اس کی روشنی سے چمک اٹھے۔ چڑیاں پھدکنے اور چھپانے لگیں۔ درختوں کی شاخیں ہواؤں میں ہلتی ہوئی دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا وہ ربانی نعمہ کو سن کر رقص کر رہی ہوں۔ سارا ماحول قدرتی حسن کے سیلاب میں ڈوب گیا۔ اچانک میری زبان پر قرآن کی یہ آیتیں آگئیں:

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتَابُ وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (39:69)۔ یعنی، اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی۔ اور کتاب رکھ دی جائے گی اور پیغمبر اور گواہ حاضر کیے جائیں گے۔ اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

میں نے کہا، آج کی دنیا سورج کے نور سے روشن ہوتی ہے، آخرت کی دنیا براہ راست نورِ خداوندی سے روشن ہوگی۔ آج کائنات کی چیزیں خدا کے آلاء (کرشموں) پر غیر ملفوظ حمد کہہ رہی ہیں، آخرت میں ساری کائنات ملفوظ طور پر الحمد للہ رب العلمین کہہ اٹھے گی۔ آج ہر آدمی اپنی مرضی چلانے کے لیے آزاد ہے، آخرت میں کتاب اور میزان عدل کی حکمرانی ہوگی۔ آج دھاندلی اور موقع پرستی میں زور ہے، آخرت میں صرف ان باتوں میں زور ہوگا جن کو لے کر انبیاء اور شہدا کھڑے ہوئے۔

خدا کے ظہور کے بعد دنیا کیسی عجیب و غریب دنیا ہوگی۔ اس کا ابتدائی اندازہ اسی فانی دنیا میں ہو رہا ہے۔ یہاں قدرت کی دنیا کو دیکھیے۔ سورج یہ مظاہرہ کر رہا ہے کہ تاریک مادہ کس طرح خدا کے حکم سے روشن ہو جاتا ہے۔ درخت یہ منظر پیش کر رہے ہیں کہ خدا کس طرح مادہ کو شاداب درخت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ زندگی کی انواع بتا رہی ہیں کہ خدا کا اشارہ پا کر کس طرح بے جان چیز جاندار کی

صورت اختیار کر لیتی ہے۔ انسانی دماغ کا حیرت ناک واقعہ بتا رہا ہے کہ بے شعور جسم کس طرح شعور اور ارادہ کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔

خدا کی دنیا کیسی عجیب ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ہم یہ سوچیں کہ کیا تمام انسان مل کر ایسی دنیا بنا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام انسان مل کر ایک پتی بھی نہیں بنا سکتے اور کائنات کا یہی ایک پہلو اس کی حیرت ناک کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

انسان کے لیے کوئی ایسا کارخانہ بنا ناممکن نہیں جس کے اندر مٹی ڈالی جائے اور وہ درخت بن کر نکلے جس کے اندر گھاس ڈالی جائے اور وہ دودھ اور گوشت بن کر نکلے۔ جس کے اندر لکڑی اور پتھر ڈالا جائے اور وہ پھول اور پھل بن کر نکلے۔ مگر خدا کی دنیا میں ہر آن بے حساب مقدار میں یہ سارے واقعات ہو رہے ہیں۔

امریکی انسان جب خلائی جہاز کے ذریعہ چاند پر پہنچا تو میں اس روز رات کو ایک اردو اخبار کے دفتر میں گیا۔ اس وقت ٹیلی پرنٹر پر تفصیلات آرہی تھیں اور وہ مسلسل ترجمہ کر کے کاتب صاحبان کو دی جا رہی تھیں۔ ایڈیٹر صاحب نے گفتگو کے دوران کہا: بڑی تھرننگ نیوز آرہی ہیں۔

میں نے سوچا، کیسی عجیب بات ہے کہ انسانی واقعات لوگوں کے اندر تھرل (thrill) پیدا کر رہے ہیں۔ مگر خدائی واقعات ان کے اندر کوئی تھرل پیدا نہیں کرتے۔ لوگ مخلوقات کے کارناموں کو دیکھ کر جھوم اٹھے ہیں مگر خالق کے کارناموں کو دیکھ کر جھومنے والا کوئی نہیں۔

گراموفون کا ریکارڈ بظاہر ایک کامل خاموش تختی ہے۔ لیکن اگر اس کے اوپر سوئی رکھ دیجیے تو اچانک وہ ایک انتہائی بولنے والی تختی بن جائے گی۔ یہی حال موجودہ کائنات کا ہے۔ کائنات بظاہر انتہائی خاموش ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ریکارڈ سے زیادہ آوازیں اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ خدا نے کمال درجہ قدرت کے ساتھ ایک انتہائی بولتی ہوئی کائنات کو ایک انتہائی خاموش کائنات میں تبدیل کر دیا ہے۔ تاکہ اس کے سریلے نعموں کو وہی لوگ سنیں جو اس کو سننے کا حق رکھتے ہیں۔ اور جو ناکارہ لوگ ہیں وہ اس کو سننے اور جاننے سے اندھے بہرے بنے رہیں۔

آج کی دنیا کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہی اندھا پن اور بہرا پن ہے۔ کائنات خدا کا انتہائی

کھلا ہوا ظہار ہے۔ مگر یہی سب سے زیادہ کھلا ہوا اظہار آج سب سے زیادہ چھپا ہوا واقعہ بن گیا ہے۔ آج نہ کوئی آنکھ ہے جو اس کو دیکھے اور نہ کوئی زبان ہے جو اس کو بیان کرے۔

خدا کی دنیا خدا کی باتوں سے خالی ہو رہی ہے۔ آج انسانوں کی عظمت بیان کرنے والے بے شمار ہیں، مگر خدا کی عظمت بیان کرنے والا کوئی نہیں۔ تاریخی نشانیوں کو دیکھ کر لوگ تڑپ رہے ہیں، مگر خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر تڑپنے والا کوئی نہیں۔ مخلوقات کی شان میں گم ہونے والے بے شمار ہیں، مگر خدا کی شان میں گم ہونے والا کوئی نہیں۔

آہ، کیسی عجیب ہے وہ دنیا جہاں ہر طرف دوڑ لگ رہی ہو، مگر خدا کی طرف دوڑنے والا کوئی نہ ہو۔ جہاں انسانی تقریریں سننے کے لیے لوگوں کی بھیڑ جمع ہو، مگر جہاں خدا کی آواز نشر کی جا رہی ہے وہاں سناٹے کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے۔

اگر کوئی شخص دور کائنات میں کھڑے ہو کر پوری کائنات کو دیکھ سکے تو وہ ایک حیرت انگیز منظر کو اپنی آنکھ سے دیکھے گا۔ وہ دیکھے گا کہ ایک اٹھارہ کائنات ہے جس میں یا تو دہشت ناک خلا ہے، یا دیکتے ہوئے ستارے یا پھر خشک دوڑتی ہوئی چٹانیں۔ اس ناقابل قیاس حد تک وسیع کائنات میں ایک ہی استثنا ہے اور وہ اس چھوٹے سے ذرے کا ہے جس کو زمین کہتے ہیں۔ معلوم کائنات میں صرف زمین ہی ایک ایسا کرہ ہے جہاں پانی کی روانی ہے۔ جہاں ہریالی کا رقص ہے۔ جہاں زندگی کی رعنائیاں ہیں۔ جہاں یہ حیرت ناک واقعات پائے جاتے ہیں کہ مادہ ہریالی میں تبدیل ہو۔ جہاں گھاس کھانے والے گھاس کھا کر اس کو دودھ اور گوشت میں کنورٹ کریں۔ جہاں وہ انسان ہو جو دیکھے اور سوچے اور نقشہ بنائے۔

ایسی استثنائی زمین پر انسان کو بسانا بتاتا ہے کہ خدا انسان کے اوپر ایک استثنائی انعام کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ کائنات کے اندر ایک انوکھی دنیا بنائی جائے جس کا نام جنت ہو۔ جہاں ہر قسم کی لذتیں جمع ہوں۔ جو ہر قسم کے ناموافق حالات سے پاک ہو۔ جو خدا کی صفات کمال کا ابدی ظہور ہو۔

”یہ انوکھی جنت کس کو ملے گی“، میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اور قدرت کی حسین دنیا میرے لیے اس سوال کا جواب بن گئی۔ موجودہ زمین گویا ایک قسم کا ابتدائی نمونہ ہے، جو بتاتا ہے کہ

خدا آئندہ اپنی پسند کی کون سی دنیا بنانا چاہتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ وہ اپنی پسند کی اس دنیا میں کس قسم کے لوگوں کو بسائے گا۔ جنت اس کو ملے گی جو خدا کی دنیا میں درخت کی طرح شادابی کا ثبوت دے۔ وہ اس کو ملے گی جو چڑیوں کی طرح خدا کی حمد کے نغمے گائے۔ وہ اس کے حصہ میں آئے گی جس کی روح سورج اور چاند کی طرح خدا کے نور سے چمک اٹھی ہو۔

یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی دنیا میں خدا کے داعی بنتے ہیں۔ خدا کی دعوت خدا کے اس خاموش پیغام کی ترسیل (relay) کا دوسرا نام ہے جو کائنات میں ہر آن نشر ہو رہا ہے۔ خدا کا داعی وہ ہے جو خدا کے فیضان کا آخذ (recipient) بن جائے۔ وہ بولے تو اس کی آواز زمین و آسمان میں بلند ہونے والی گونج سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات، انسانی الفاظ میں اس حمد کی ترجمانی بن جائیں، جو چڑیوں کی زبان سے فطرت کے لہجے میں سنائی جا رہی ہے۔ آخرت کا داعی بننے کے لیے دنیا سے بلند ہونا پڑتا ہے۔ لوگ دنیا میں گم ہیں پھر وہ آخرت کے داعی کیسے بن سکتے ہیں۔ داعی بھی اگر وہیں کھڑا ہوا ہو جہاں لوگ کھڑے ہوئے ہیں تو وہ کبھی لوگوں کے اوپر داعی نہیں بن سکتا۔ (الرسالہ، نومبر 1984)

خدا کی معرفت

انسان خدا کو براہ راست نہیں دیکھ سکتا، لیکن وہ کائنات کے مشاہدے اور اس کے نظام کی معرفت کے ذریعے خدا کی موجودگی کے یقین تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ کائنات خود ایک قائم شدہ حقیقت ہے، اور خدا وہ ہستی ہے جس نے اسے پیدا کیا۔ دوسرے لفظوں میں، خدا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا، اور وہ ہر لمحہ اسے قائم رکھنے کے اسباب پیدا کرتا جا رہا ہے۔ ایک انسان کائنات میں پھیلی ہوئی ان نشانیوں کے ذریعے خدا کو دریافت کر سکتا ہے۔

خدا کا وجود

کو الالمپور، ملیشیا کے سفر 1984 کا واقعہ ہے۔ راقم الحروف کو المعهد العلمی للفکر الاسلامی (International Institute of Islamic Thought) کے تیسرے سیمینار میں مقالہ پڑھنے کے لیے بلایا گیا تھا، جو کو الالمپور میں منعقد ہوا تھا۔ مہمانوں کے لیے ایک بڑا ہال نماز باجماعت کے لیے خاص کیا گیا تھا۔ یکم اگست 1984 کو جب میں اس ہال میں پہنچا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ ہال کی لمبی دیواریں پوری کی پوری شیشہ کی تھیں، اس لیے باہر کی دنیا بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اندر ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس کے اندر مکمل سٹائٹ تھا۔ باہر کی دنیا میں بھی چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف درخت اور پہاڑ اور بادل اور آسمان دکھائی دے رہے تھے۔

اس طرح کی ایک دنیا میں، میں اکیلے ایک انسان کی حیثیت سے کھڑا ہوا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرا وجود خدا کے وجود کا ثبوت بن رہا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ اسی لیے نہیں مانتے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مادی کائنات میں کہیں کوئی زندہ اور باشعور ہستی بھی ہے۔ جو ہم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے۔ انھیں لوگوں کو اس وقت کوئی تعجب نہیں ہوتا جب کائنات کے کسی بعید مقام پر ایک نیا ستارہ دریافت ہو۔ وہ فوراً اس کو مان لیتے ہیں، مگر ان کو یہ یقین نہیں آتا کہ یہاں خدا جیسا کوئی زندہ وجود بھی ہے، جو کائنات میں کہیں ممکن ہے۔

مگر مذکورہ ہال میں جب میں ایک زندہ وجود کی حیثیت سے تھا اور چیزوں کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا تو اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے وجود کی صورت میں خدا کے وجود کو دیکھ رہا ہوں۔ ”جیسے میں یہاں ہوں اسی طرح خدا بھی تو ہوگا“۔ میں نے سوچا اگر یہاں ایک زندہ شخص موجود ہے تو کسی دوسرے مقام پر دوسری زندہ اور باشعور ہستی کیوں موجود نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ ایک ماننے اور دوسرے ماننے میں صرف درجہ کافرق ہے، ان میں نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔ (الرسالہ، دسمبر 1984)

قدیم و جدید

ابتدائی دور میں عربوں نے عملی سائنس کو بہت کچھ ترقی دی۔ مثال کے طور پر یہ عرب ہی تھے جنہوں نے ساتویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے قابل استعمال گھڑی تیار کی۔ جو اہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں اعتراف کیا ہے کہ اُس زمانہ میں دمشق میں ایک مشہور گھڑی موجود تھی، اور اسی طرح ہارون رشید کے زمانہ کے بغداد میں:

Damascus had a famous clock and so did the Baghdad of Harun-al- Rashid's day. (p. 261)

گھڑی کو مسلمانوں نے شروع کیا۔ مگر اس کو ترقی یافتہ صنعت بنانے کا تمام کام مغرب میں ہوا۔ آج یہ حال ہے کہ صرف گھڑیوں کی خریداری میں مسلم ملکوں کے کروڑوں ڈالر ہر سال مغربی دنیا میں پہنچ رہے ہیں۔ یہی معاملہ دوسری تمام جدید صنعتوں کا ہے۔ ان صنعتوں کا آغاز کرنے والے مسلمان تھے، مگر بعد کو وہ خود تو باہمی جھگڑوں میں پڑ گئے اور مغرب ان کی چیزوں کو لے کر ساری دنیا پر چھا گیا۔

مسلمانوں میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو مذکورہ ماضی پر فخر کرتے ہیں۔ مگر ان میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو حال میں دوبارہ وہ کام کرنے کا پیغام دے جو ماضی میں قدیم مسلمانوں نے کیا تھا۔ یہ محض فخر ہے، اور فخر کبھی عمل کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

اسٹیم پاور سے چلنے والے جہاز کے وجود میں آنے سے پہلے تک مسلمان سمندری جہاز رانی میں دنیا سے آگے تھے۔ حتیٰ کہ ایک مؤرخ کے الفاظ میں، انھوں نے میڈیٹیرینین سمندر کو عرب جھیل بنا دیا تھا:

Mediterranean became a Musulman lake. (Mohammed and Charlemagne by Henri Pirenne, p. 162)

مگر آج اسٹیم شپ کے دور میں مسلمانوں کی کوئی جہاز ران کمپنی نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے

کہ بعد کو اپنے دور زوال میں پہنچنے کی وجہ سے مسلمانوں نے یہ صلاحیت کھودی کہ وہ نئی چیزوں کو سیکھیں اور نئی تحقیقات پر دھیان دیں۔ انھوں نے ہر معاملہ میں ”قدیم“ سے جڑے رہنے کو مذہب سمجھا اور ”جدید“ سے وابستہ ہونے کو لامذہبیت سمجھنے لگے۔

امور دین (عقائد، عبادات، اخلاق) کے معاملے میں ہم کو بلاشبہ پیچھے کی طرف دیکھنا ہے۔ مگر امور دنیا کے معاملے میں ہم کو آگے کی طرف نظر رکھنا ہے۔ موجودہ مسلمان اس فرق کو نہ سمجھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زمانہ حاضر میں ایک کچھڑی ہوئی قوم بن گئے۔ (الرسالہ، اکتوبر 1992)

آفاقی نقطہ نظر

موت ہر ایک کے اوپر اچانک آتی ہے۔ اس بنا پر انسان مجبور ہے کہ موت کے معاملے میں غیر یقینی حالت میں جیے۔ یہ غیر یقینی حالت صرف موت کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر معاملے کے بارے میں ہے۔ انسان کو چاہیے کہ فطرت کے اس قانون کو وہ قبول کرے، ورنہ وہ اس معاملے میں اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔

انسان کا ہر عمل اتنا زیادہ وسیع الاطراف ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس کو ساری کائنات کی موافقت حاصل ہو۔ ساری کائنات کی کامل موافقت کے بغیر کوئی بھی انسان اپنے کسی منصوبہ کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی ہر آن عالمی نظام فطرت کے تحت سوچے۔ وہ کبھی یہ نہ سمجھے کہ وہ اپنے محدود وسائل کے ذریعے اپنے کسی منصوبے کو بطور خود مکمل کر سکتا ہے۔

آدمی جب بھی کوئی منصوبہ بناتا ہے، خواہ وہ بظاہر چھوٹا ہو یا بڑا۔ لیکن وہ اپنے دائرے کے اعتبار سے عملاً ایک عالمی منصوبہ ہوتا ہے۔ پورے عالم کی مشارکت کے بغیر وہ اپنے کسی بھی منصوبے کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر آفاقی نقطہ نظر پیدا کرے۔

علم کی حد

فلسفی یا سائنس داں، جس شخص نے بھی گہرا علمی مطالعہ کیا ہے، آخر میں وہ اس رائے پر پہنچتا ہے کہ انسانی علم کی ایک حد ہے۔ اس حد سے آگے انسان کے لیے جانا ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر فلسفیوں کے درمیان یہ بحث تھی کہ انسان کے وجود کا علمی ثبوت کیا ہے۔ مشہور فلسفی ڈیکارٹ نے کہا کہ میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں:

I think, therefore I am. (*A Discourse on Method*, Introduction, p. 17, 20)

مگر یہ جواب کافی ثابت نہیں ہوا۔ کیوں کہ دوبارہ یہ سوال سامنے آیا کہ یہ تو ایک داخلی ثبوت (subjective evidence) ہے، نہ کہ موضوعی ثبوت (objective evidence)۔ داخلی ثبوت کسی شخص کو ذاتی یقین دے سکتا ہے، لیکن دوسرے شخص کے لیے اس میں یقین کا سامان موجود نہیں۔ یہ ایک طرفہ ثبوت ہے، نہ کہ دو طرفہ ثبوت۔

سائنس دانوں نے طبیعیاتی دنیا کا مطالعہ شروع کیا۔ آخر میں وہ ایٹم تک پہنچے۔ لیکن ایٹم بھی ٹوٹ گیا اور اس کے بعد جو کچھ تھا وہ ناقابل مشاہدہ تھا، یعنی ایک سائنس داں کے الفاظ میں قیاسی لہریں (waves of probability)۔ اس کے بعد سائنس داں اس ناقابل حل سوال میں مبتلا ہو گئے کہ ہماری دنیا کا وجود خارجی (objective) ہے یا داخلی (subjective)۔

علم کے تمام شعبوں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ انسان اپنی موجودہ صلاحیت کے ساتھ اس کی آخری حد تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایسی حالت میں یہ سب سے بڑا علم ہے کہ انسان علم کی حد کو جانے۔ اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنا بے حد خطرناک ہے۔ کیوں کہ وہ آدمی کو صرف کنفیوزن (confusion) تک پہنچائے گا، نہ کہ یقین تک۔ علم کا آخری مطلوب یقین ہے۔ جو طریق مطالعہ یقین تک پہنچائے وہ علم ہے، اور جو طریق مطالعہ بے یقینی یا کنفیوزن تک پہنچائے، وہ بلاشبہ بے علمی ہے، خواہ کوئی شخص اس کو علم کا درجہ دیتا ہو۔ (الرسالہ، جولائی 2015)

کھلا پن

موجودہ زمانے میں ایک ٹرم اکثر استعمال ہوتی ہے۔ وہ ہے کھلا پن (openness)۔ اس کا مطلب ہے — کسی ریزرویشن کے بغیر بات کو کھلے ذہن کے ساتھ سننا، خواہ وہ اپنے نقطہ نظر کے مطابق ہو یا خلاف:

The quality of being honest and willing to talk about things without preoccupation.

یہ حسن ذوق کی بات ہے، اور یہ حسن ذوق فطرت کا ایک انوکھا عطیہ ہے، جو کسی انسان کو دیا جاتا ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ حسن ذوق موجود ہو، اس کے اندر گویا فطری حق کو پہچاننے اور اس کو قبول کرنے کا استحقاق موجود ہے۔

یہ کھلا پن یا یہ حسن ذوق اس انسان کو ملتا ہے، جو اپنی فطرت کو محفوظ حالت میں باقی رکھتے ہیں۔ جو فطرت کے عطیے کو بگاڑ کا شکار نہ ہونے دے۔ فطرت کو محفوظ رکھنا گویا جنت کے استحقاق کو محفوظ رکھنا ہے۔ اس حسن ذوق کے بغیر کسی کو جنت میں داخل کرنا ایسا ہی ہے، جیسے کسی حیوان کو ایک انسانی محل میں داخل کر دینا۔

کھلا پن کا فائدہ کیا ہے۔ کھلا پن کا فائدہ یہ ہے کہ جہاں کھلا پن ہو، وہاں تعلّم (learning) برابر جاری رہے گی، لرننگ کا تسلسل کہیں ختم نہ ہوگا۔ تعلّم ایک دو طرفہ عمل ہے۔ سیکھنے والے کے لیے بھی، اور سکھانے والے کے لیے بھی۔ تعلّم کا تسلسل صرف اس وقت ختم ہوتا ہے، جب کہ انسان پیشگی مفروضہ کے ساتھ باتوں کو سننا شروع کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی ترقی کے لیے تعلیم اور تعلّم دونوں یکساں طور پر اہم ہیں۔

اس اصول کے مطابق، کسی انسان کو اپنے اندر آجیکلیو تھکنگ (objective thinking) کی صفت پیدا کرنی چاہیے، یعنی غیر جانبداری کا انداز۔ آدمی کے اندر جتنا زیادہ غیر جانبداری کا انداز ہوگا، اتنا ہی وہ فطرت کے اس نظام سے فائدہ اٹھائے گا۔

معرفت، معلومات

ایک ہے دین کی معلومات، اور دوسری چیز ہے دین کی معرفت۔ معلومات ہمیشہ ایک قانونی نوعیت کی چیز ہوتی ہے۔ معلومات کی مثال ایسی ہے جیسے کمپیوٹر میں تمام قانونی دفعات بھر دیے جائیں۔ ایسا کمپیوٹر سوچ دبانے پر اپنے اندر فیڈ کی ہوئی معلومات کو کاغذ پر لکھ دے گا۔ مگر ایسے کاغذ پر دین ایک زندہ حقیقت کے طور پر موجود نہ ہوگا۔ وہ ٹیکنکل یا فنی اعتبار سے الفاظ کا ایک مجموعہ ہوگا، لیکن وہ زندہ دین کا نمائندہ نہ ہوگا۔ وہ ایک الفاظ کا مجموعہ ہوگا جہاں بظاہر کچھ فنی معلومات تو ہوں گی، لیکن وہ زندہ وجود نہ ہوگا، جو قرآن کے الفاظ میں اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرے، اور اللہ سے سب سے زیادہ خوف کرے۔

دین کی معرفت ہمیشہ ایک زندہ انسان کے ساتھ ہوتی ہے۔ دین کی معرفت اور زندہ انسان جب دونوں اکٹھا ہو جائیں تو اس سے وہ ربانی انسان بنتا ہے جو جنتی اوصاف کا حامل ہو۔ جو ربانی حقیقت کا حامل ہو۔ جو اس قابل ہو کہ آخرت کی عدالت میں اس کو جنت میں آباد کرنے کے لیے منتخب کیا جائے۔

جو تقریر یا تحریر معلومات کی بنیاد پر کی جائے، وہ بظاہر شاندار ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی مثال پلاسٹک کے پھول کی ہے، بظاہر شاندار لیکن حقیقت کے اعتبار سے مکمل طور پر بے روح۔ بظاہر وہ تقریر و تحریر ہوگی۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ تقریر ہوگی، اور نہ تحریر۔ کیوں کہ اس میں الفاظ ہوں گے، لیکن اس میں اسپرٹ موجود نہ ہوگی۔

اس کے برعکس، وہ تقریر و تحریر جو معرفت پر مبنی ہو۔ اس میں علم کے ساتھ گہری معنویت ہوگی۔ اس میں الفاظ کے ساتھ اسپرٹ کا خزانہ ہوگا۔ اس میں صرف کان سے ٹکرانے والے الفاظ نہ ہوں گے، بلکہ دلوں میں اترنے والے حقائق بھی ہوں گے۔ اس میں کلام بھی ہوگا، اور کلام کے ساتھ داخلی کیفیات بھی۔

کامیابی کا راز

الفریڈ ایڈلر (1870-1937) مشہور نفسیاتی عالم (Psychologist) ہے۔ اس کا مخصوص موضوع شخصی نفسیات (Individual Psychology) ہے۔ پوری عمر انسان اور انسان کی چھپی ہوئی محفوظ قوتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے یہ اعلان کیا کہ انسانی شخصیت کی خصوصیات میں سے ایک حیرت ناک خصوصیت اس کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک نہیں کو ہے میں تبدیل کر سکے:

One of the wonder-filled characteristics of human beings is "their power to turn a minus into a plus."
(Dale Carnegie: *How to Stop Worrying and Start Living*,
Ch. 17, p. 143)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو انتہائی غیر معمولی صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مذکورہ اقتباس ایک نفسیات کی زبان سے اس کا اعتراف ہے۔ اسی صلاحیت کی آخری حد یہ ہے کہ انسان تاریکی میں بھی روشنی کا پہلو دیکھ لیتا ہے۔ وہ ناموافق حالات کو موافق حالات میں تبدیل کر سکتا ہے۔ جب اس کی بازی کھوئی گئی ہو، اس وقت وہ دوبارہ اپنے لیے نیا میدان تلاش کر لیتا ہے، جس میں جدوجہد کر کے، وہ از سر نو اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان فطری طور پر well equipped ہے کہ وہ اپنے ”نہیں“ کو اپنے ”ہے“ میں تبدیل کر سکے۔ لیکن اس کی ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ وہ نزاعی طریق کار (confrontational approach) کو چھوڑے، اور مینجمنٹ (management) کا طریقہ اختیار کرے۔ آدمی کو چاہیے کہ جب بھی کوئی صورت حال سامنے آئے، تو پہلے اس کا مطالعہ (study) کرے، اور پھر غیر نزاعی طریق کار (non-confrontational approach) کو اختیار کرتے ہوئے آہنکلیو طریقے (objective way) میں اپنے عمل کی پلاننگ کرے۔

زندگی میں کامیابی کا راز مینجمنٹ پر مبنی ہے، نہ کہ چینج (change) پر۔ غیر نزاعی طریق کار ہمیشہ مثبت نتیجہ (positive result) دیتا ہے، اور نزاعی طریق کار ہمیشہ مسئلے میں اضافہ کرتا ہے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں ہر صورت حال میں کام کے مواقع موجود رہتے ہیں۔ لوگ اکثر مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر صورت حال میں کام کے مواقع تلاش کیے جائیں۔ ہر صورت حال میں مواقع (opportunities) کی بنیاد پر اپنے کام کی منصوبہ بندی کی جائے۔ مواقع کو تلاش کرنا، اور مواقع کی بنیاد پر اپنے عمل کا نقشہ بنانا، دانش مندانہ طریقہ ہے۔ یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں وہی منصوبہ کامیاب ہوتا ہے، جو اسباب کی رعایت کرتے ہوئے بنایا جائے۔

اس دنیا میں منصوبہ بند کام ہی حقیقی کام ہے۔ جو کام غیر منصوبہ بند انداز میں کیا جائے، وہ اپنے انجام کے اعتبار سے عملاً کوئی کام نہیں ہوتا۔ جب بھی ایسا ہو کہ آپ کا کوئی عمل بے نتیجہ رہ جائے، تو ہرگز کسی دوسرے کو الزام نہ دیجیے، بلکہ بے لاگ احتساب کے ساتھ خود اپنے منصوبے کی خامی کو تلاش کیجیے۔ اپنے منصوبے کی خامی درست کیجیے، آپ دوبارہ کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

اسٹیج ایکٹوزم کا دور

موجودہ زمانہ ایک اعتبار سے اسٹیج ایکٹوزم کا زمانہ ہے۔ جو آدمی اسٹیج پر عوام پسند بولی بول سکے، وہ اچانک مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ لوگ اس کی باتوں کو شوق کے ساتھ سنتے ہیں، اور تالیاں بجاتے ہیں۔ اس کو تیزی سے سستی مقبولیت (cheap popularity) حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ میڈیا میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ خوبصورت الفاظ بولنا ہی اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے کہ وہ ہر جگہ سنا جائے۔ میڈیا میں اور اخبارات میں اس کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ مجلسوں میں اس کا چرچا ہوتا ہے، وغیرہ۔

اسٹیج کلچر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے اندر احتساب خوبیش (self-introspection) کا مزاج نہیں بن پاتا ہے، اس کے بجائے وہ احتساب غیر میں جینے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ دوسروں کو خوش کرنے والی بولی بولتے ہیں۔ انھیں اس کا وقت نہیں ملتا کہ وہ اپنے بارے میں سوچیں، اور اپنے ذہنی ارتقا کی فکر کریں۔

میں اہم تھا

اردو کے ایک مشہور شاعر میر تقی میر (1723-1810) کا شعر ہے:

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھو کسو کا سر پُر غرور تھا

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ میر تقی میر ایک قبرستان گئے، وہاں پر ایک مردہ انسان کی کھوپڑی ان کے پاؤں کے نیچے آگئی، اس پر انھوں نے انسانی کھوپڑی کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ شعر کہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی حقیقت نہیں بھولنی چاہیے۔ وہ بے شک اپنی زندگی میں کتنا ہی امیر کبیر، اور کتنا ہی عظمت والا رہا ہو، مرنے کے بعد دنیا سے اس کو خالی ہاتھ ہی جانا ہے۔ مرنے کے بعد انسان کی ساری اکڑ اور اس کا سارا غرور خاک میں سما جاتا ہے۔

ایک صاحب کا واقعہ ہے۔ وہ ایک مرتبہ کسی کے جنازے میں قبرستان گئے، وہاں انھوں نے ایک قبر پر یہ لکھا ہوا دیکھا تھا— میں اہم تھا، یہی میرا وہم تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ انسان اپنی طاقت اور جوانی کے دنوں میں اپنی موت کو بھلائے رہتا ہے، مگر جب اس کا بڑھاپا آتا ہے، یا اس کی موت آجاتی ہے تو اس کی ساری شان و شوکت ختم ہو جاتی ہے۔ گویا وہ اس انسان کی نہیں تھی۔

ایک قاری الرسالہ کا واقعہ ہے۔ جوانی کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ پہلی بار جب میں ان سے ملا تھا تو بظاہر وہ بالکل تندرست اور صحت مند نظر آتے تھے۔ بعد کو انھیں کینسر کی بیماری ہو گئی۔ علاج کے باوجود مرض بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ صاحب فراش ہو گئے۔ آخری زمانے میں ان کا حال یہ تھا کہ وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن چکے تھے۔ اُس زمانے میں کوئی شخص ان کی عیادت کے لیے آتا تو وہ اُس سے کہتے کہ تم میرے بارے میں نہ سوچو، بلکہ خود اپنے بارے میں سوچو۔ تم شکر کرو کہ تم کو صحت مند جسم حاصل ہے۔ تم کھانا کھاتے ہو اور پانی پیتے ہو اور زمین پر چلتے ہو۔ یہ سب چیزیں خدا کا عطیہ ہیں۔ وہ جب چاہے، اس عطیہ کو چھین لے اور پھر تمہارے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے۔

انسان کو ایک صحت مند جسم ملا ہوا ہے۔ انسان کو پیدا ہونے کے بعد یہ صحت مند جسم بظاہر اپنے آپ مل جاتا ہے، اس لیے وہ اُس کو فارگراٹڈ (for granted) لے لیتا ہے۔ وہ کبھی سوچتا نہیں کہ یہ صحت مند جسم سرتا سرتا خدا کا عطیہ ہے۔ اس عطیہ کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے خدا کے آگے جھک جانا چاہیے۔ یہی معاملہ عمر کا ہے۔ آدمی جب تک زندہ ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کی یہ زندگی ہمیشہ باقی رہے گی۔ وہ کبھی اپنی موت کے بارے میں نہیں سوچتا۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی بھول ہے۔

یہی ہر عورت اور ہر مرد کا امتحان (test) ہے۔ کامیاب شخص وہ ہے جو زندگی سے زیادہ موت کے بارے میں سوچے، جو ہر ملی ہوئی چیز کو خداوندِ عالم کا عطیہ سمجھے۔ یہی وہ انسان ہے جو امتحان میں کامیاب ہوا۔ اس کے برعکس، جو انسان خدا کا اعتراف نہ کرے اور موت کو بھلائے ہوئے ہو، وہی وہ شخص ہے جو امتحان میں ناکام ہو گیا۔ پہلے انسان کے لیے ابدی جنت ہے اور دوسرے انسان کے لیے ابدی ناکامی۔

بڑھاپے کا دور

بڑھاپے کا دور انسان کے لیے عجز کی دریافت کا آخری موقع ہے۔ جس انسان کے اوپر بڑھاپے کا دور گزرے، وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنے عجز کو دریافت کرے۔ عجز کی دریافت دوسرے اسباب سے بھی جزئی طور پر ہوتی رہتی ہے، لیکن کامل معنوں میں عجز کی دریافت صرف بڑھاپے سے حاصل ہوتی ہے۔

انسان جب جوانی کی عمر میں ہوتا ہے، اس کی تمام قوتیں شباب پر ہوتی ہیں۔ اس کے تمام آرگنز (organs) پوری طرح کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ یہ سمجھے لگتا ہے کہ ان قوتوں کا مالک وہ خود ہے۔ بڑھاپے کی عمر اس غلط فہمی کی تردید ہے۔

امن کا فارمولہ

تمام فلاسفہ اور مصلحین اور مفکرین، امن (peace) کے موضوع پر کلام کرتے رہے ہیں۔ اس موضوع پر اتنا زیادہ لکھا گیا ہے کہ وہ ایک مستقل ڈسپلن (discipline) بن گیا ہے۔ اس ڈسپلن کا اصطلاحی نام پیسفرم (pacifism) ہے۔ پیسفرم کا مطلب ہے، عدم تشدد کا طریقہ یا امن پسندی۔ انگریزی ڈکشنری ویبسٹر کے الفاظ میں، پیسفرم اس نظریے کا نام ہے کہ قومی یا بین الاقوامی نزاعات کو صرف پر امن ذرائع سے طے کرنا چاہیے، بجائے اس کے کہ طاقت یا جنگ کے ذریعے اس کو طے کیا جائے:

Pacifism: Belief that national or international disputes should be settled by peaceful means, rather than by force or war.

پیسفرم کا یہ نظریہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں شروع ہوا۔ اس نظریے پر بڑے بڑے دماغوں نے کام کیا ہے۔ مثلاً لارڈ برٹریٹنڈرسل، وغیرہ۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ سو برس سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد بھی یہ نظریہ اب تک واقعہ نہیں بنا، نہ مقامی سطح پر اور نہ بین الاقوامی سطح پر۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پیسفرم کے علمبردار، پیسفرم کا کوئی قابل عمل فارمولہ پیش نہ کر سکے۔

اس معاملے میں قابل عمل فارمولہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے، ڈی لنکنگ پالیسی (de-linking policy)۔ یعنی مسائل (problems) اور مواقع (opportunities) کو ایک دوسرے سے الگ کر دینا۔ مسائل کو پر امن گفت و شنید کے میز پر رکھ دینا، اور جہاں تک مواقع کا تعلق ہے، اس کا استعمال فوراً شروع کر دینا۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ مواقع ہمیشہ موجود رہتے ہیں، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ نزاع (dispute) میں الجھ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ نہ ملنے والی چیز کی خاطر، ملنے والی چیز کو بھی کھودیتے ہیں۔ اس دنیا میں صرف پریکٹکل پیسفرم ممکن ہے، نہ کہ آئیڈیل پیسفرم۔ اس عملی پالیسی کا دوسرا نام صبر اور اعراض ہے۔

ڈاعری 1986

23 جولائی 1986

آج ایک خط موصول ہوا۔ خط میں مکتوب نگار کا نام و پتہ حسب ذیل طریقہ سے لکھا ہوا تھا:

جناب امان اللہ صاحب، صدر آل انڈیا تنظیم فلاح ملت، ضلع جون پور

اپنے اس خط مورخہ 17 جولائی 1986 میں وہ لکھتے ہیں: ”ہندوستان کی آزادی کے بعد

مسلمانوں نے جو خواب دیکھا تھا وہ آج تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اب تک کے فسادات میں تقریباً

ڈھائی لاکھ مسلمان جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ کبھی مسلم پرسنل لایا میں مداخلت کی جاتی ہے۔ کبھی

قرآن پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کبھی مسجد کو بت خانہ بنایا جاتا ہے۔ اس ملک میں

مسلمانوں کو کھانے کے لیے بندوق کی گولی، رہنے کے لیے قبرستان، پہننے کے لیے کفن دیا جاتا

ہے۔ کیا ان حالات کے پیش نظر موالات حرام اور ترک موالات واجب ہے۔“

اس کے جواب میں، میں نے مکتوب نگار کو لکھا:

”آپ کا خط مورخہ 17 جولائی کو ملا۔ آپ اگر واقعتاً ملت کے مستقبل کی تعمیر کے لیے سنجیدہ ہیں تو

میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ ماہنامہ الرسالہ کی ایجنسی لے لیں۔ اور محنت کر کے اس کو اپنے علاقہ

میں پھیلائیں۔ یہی مسئلہ کا حل ہے۔ اس کے سوا جو باتیں ہیں وہ سب محض ذہنی ورزش ہیں، جن کا

کوئی فائدہ نہ آپ کو ملنے والا ہے اور نہ امت مسلمہ کو۔“

یہ بات جو میں نے لکھی، یہ بطور مذاق نہیں لکھی۔ بلکہ سنجیدہ طور پر یہی میرا خیال ہے۔ مسلمان

اس وقت جن مسائل میں مبتلا ہیں، ان سب کی ایک ہی جڑ ہے۔ اور وہ ان کی بے شعوری ہے۔ اس

بے شعوری میں ان کے اصغر اور اکابر سب مبتلا ہیں۔ الرسالہ کی تحریک قوم کو اس بے شعوری سے

نکلنے کی تحریک ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں کو اس کے سوا اور کیا مشورہ دیا جاسکتا ہے کہ وہ الرسالہ

کو پڑھیں اور دوسروں کو اسے پڑھائیں۔

24 جولائی 1986

پاکستان کا ایک ہفت روزہ اخبار ہے، جس کا نام ہے ”المنبر“۔ یہ فیصل آباد سے نکلتا ہے اور اس کے ایڈیٹر حکیم عبدالرحیم اشرف ہیں۔ حکیم عبدالرحیم صاحب پاکستان کے فوجی حکمراں جنرل ضیاء الحق کے زبردست حامی ہیں۔ وہ برابراں کی حمایت میں لکھتے رہے ہیں۔ المنبر (8 جولائی 1986) میں پاکستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:

”یہی ماحول تھا کہ 5 جولائی 1977 کو مارشل لا کا اعلان ہوا اور پورے ملک میں جشن منایا گیا۔ گرتی ہوئی دیواریں تھم گئیں اور مارشل لانے دین، عظمت، شرافت، جان، مال ہر چیز کو تحفظ فراہم کیا۔“ (صفحہ 6)

حتیٰ کہ اس مضمون میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں:

”صدر محمد ضیاء الحق کے دور میں امتناع قادیانیت آرڈیننس مارشل لا کے تحت نافذ کیا گیا۔ اور عہد صدیقی کے بعد، تاریخ میں پہلی مرتبہ ادعاء نبوت کا ذبحہ کے استیصال کا اہتمام ہوا۔“ (صفحہ 5)

ایک طرف صدر ضیاء الحق صاحب کی یہ قصیدہ خوانی ہے۔ دوسری طرف انہیں ضیاء الحق صاحب کے بارے میں پاکستان کی جماعت اسلامی کے سکریٹری جنرل قاضی حسین احمد کی تقریر اسی المنبر میں درج ہے جس میں یہ الفاظ شائع ہوئے ہیں:

” (صدر محمد ضیاء الحق کے) مارشل لا کے 9 سالہ دور میں اسلامی نظام کے نفاذ کے عمل کو جتنا نقصان پہنچا اتنا پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔“ (صفحہ 20)

ایک بیان کے مطابق پاکستان میں اسلام بالکل محفوظ ہے اور دوسرے بیان کے مطابق بالکل غیر محفوظ۔ یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ یہ دونوں بیان کسی ایک ہی ملک کے بارے میں ہیں یا دو الگ الگ ملک کے بارے میں۔

26 جولائی 1986

خواجہ کلیم الدین نانچیر یا (کافو) میں رہتے ہیں۔ وہاں وہ انگریزی کے ٹیچر ہیں۔ ملاقات کے

وقت انہوں نے بتایا کہ الرسالہ اردو و شروع سے پڑھتے رہے ہیں۔ پھر ایک روز انہوں نے افریقہ میں مجھ کو خواب میں دیکھا۔ خواب میں ان کو میں کالے افریقی کی صورت میں نظر آیا۔ اس کے بعد ان کے ذہن میں آیا کہ وہ انگریزی الرسالہ افریقہ میں چھاپیں۔ اور اس کو ”کالے براعظم“ میں پھیلائیں۔ پہلا شمارہ انہوں نے مارچ 1986 میں شائع کیا تھا اور اب ان کے مطابق وہ وہاں کافی مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

اس عمل کا آغاز 1979 سے ہوتا ہے، جب کہ الرسالہ کے دعوتی فکر کے تحت شیخ محمد سلیمان القائد طرابلس چھوڑ کر کیرگالی (روانڈا) پہنچے، جو وسط افریقہ میں واقع ہے۔ یہاں انہوں نے تعارف اسلام کا کام شروع کیا۔ وہ اگست 1986 میں ہمارے مرکز (نظام الدین ویسٹ، دہلی) آئے تھے۔ یہاں انہوں نے عربی میں ایک تقریر کی۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ افریقہ میں جو دعوتی کام میں کر رہا ہوں وہ تمام تر اسلامی مرکز کا کام ہے۔ میں نے اس کو وحید الدین خاں ہی کے ذریعہ جانا ہے، نہ کہ کسی اور کے ذریعہ:

إِنَّ الْحَقِيقَةَ أَنَّ كُلَّ هَذِهِ التَّجْرِبَةِ مِنْ هَذَا الشَّيْخِ (وَحِيدِ الدِّينِ حَآن)۔ هَذَا الَّذِي
عَلَّمَنِي الدَّعْوَةَ، لَا الْمَوْدُوْدِيَّ وَلَا سَيِّدَ قُطْبٍ....

انہوں نے چار افریقی ملکوں (روانڈا، یوگنڈا، زائر، تنزانیہ) میں تعارف اسلام کا کام پھیلا رکھا ہے۔ انہوں نے دہلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

هَذِهِ أَوَّلُ مَرَّةٍ طُبِقَتْ فِكْرَةُ الرِّسَالَةِ فِي كِبَعَالِي (أَفْرِيقِيَا)

شیخ القائد کا ایک تاثر ان کے اپنے عربی الفاظ میں الرسالہ 4 نومبر 1984 (صفحہ 40) میں شائع ہو چکا ہے۔ 1979 میں شیخ سلیمان القائد نے افریقہ میں جا کر کام شروع کیا۔ پھر خواجہ کلیم الدین صاحب ہندستان سے افریقہ گئے اور وہاں 1984 میں الرسالہ انگریزی کا افریقی ایڈیشن نکالنا شروع کیا۔ بظاہر یہ معمولی واقعات نہیں ہیں۔ یہ گویا اس مشن کی فکری ہجرت ہے۔ میں نے الرسالہ اور کتابوں میں دعوت کا جو تصور دیا ہے، وہ ہندستان میں ابھی تک عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔ مگر افریقہ میں پھیل رہا ہے۔

بھوپال کے ایک صاحب ملاقات کے لیے آئے۔ وہ کلکٹریٹ میں رجسٹرار کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہندستانی ریاستوں کے بارے میں دلچسپ باتیں بتائیں۔ انہوں نے کہا کہ الیکشن میں نواب صاحب کو روائی کانگریس پارٹی کے خلاف سرگرم تھے۔ میں نے کہا کہ آپ ہر الیکشن میں کانگریس کے خلاف رہتے ہیں اور اپوزیشن پارٹیوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے کہا:

”جس کانگریس نے ہماری ریاست چھینی ہے، ہم بھلا اس کا ساتھ دے سکتے ہیں؟“

نواب کو روائی کے اس جواب میں جو نفسیات جھلک رہی ہے، وہی ہندستانی مسلمانوں کی عام قومی نفسیات ہے۔ ہندستان کے مسلمان پچھلے دو سو سال سے اسی قسم کی منفی نفسیات کا شکار ہیں۔ ہندستان میں ریاستوں کا خاتمہ زمانہ کی تبدیلی کی بنا پر تھا۔ جن نوابوں یا راجاؤں نے اس راز کو وقت پر سمجھا انہوں نے نئے حالات کے مطابق عمل کر کے اپنے مفادات کو محفوظ کر لیا۔ مثلاً نواب جون پور نے اپنے اثاثہ کو مختلف تجارتی مدوں پر لگا دیا۔ کشمیر کے کرن سنگھ نے جمہوری حکمرانوں کا ساتھ دے کر وزارت حاصل کر لی۔ مگر جن ریاستوں نے اس کو محض ایک ”پارٹی“ کا معاملہ سمجھا، وہ بس اس پارٹی کی مخالفت بن کر رہ گئیں۔

بہی معاملہ ہندستانی مسلمانوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانے پر پیش آیا ہے۔ انیسویں صدی میں وہ اس احساس کا شکار ہوئے کہ انگریز نے ان سے ان کی ”ریاست“ چھینی۔ چنانچہ وہ انگریزوں کے خلاف نفرت اور انتقام سے بھر گئے۔ پورا انگریزی دور انہوں نے اس طرح گزارا کہ وہ انگریز کے خلاف صرف منفی کارروائی کرتے رہے اور اپنی قومی تعمیر کی کوئی مثبت منصوبہ بندی نہ کر سکے۔ اس پوری مدت میں چند بدنام مسلمانوں کے سوا کسی کا کوئی استثنا نہیں۔

آزادی کے بعد بیسویں صدی میں وہ اس منفی نفسیات کا شکار ہیں کہ ہندو نے ان سے ان کی ”ریاست“ چھین رکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دوبارہ وہ نفرت اور جھنجھلاہٹ سے بھرے ہوئے

ہیں۔ اس ملک کے مسلمان جس چیز پر کھڑے ہوئے ہیں، وہ محض نفرت ہندو ہے، نہ کہ معرفت
زمانہ۔ یہ حالت باقی رہی تو دوبارہ ان کے حصہ میں بربادی کے سوا کچھ اور آنے والا نہیں۔

28 جولائی 1986

ہندستان ٹائمز (28 جولائی 1986) میں صفحہ 8 پر ایک مضمون ہے، جس کا عنوان ہے:

Babuji Died in Mental Torture

یہ ہرنگن لیڈر بابو جگ جیون رام کے بارے میں ان کی لڑکی مسز میرا کمار کا بیان ہے۔ اس نے
کہا کہ بابو جی سخت ذہنی اذیت کے تحت اس دنیا سے گئے۔ ان کا لڑکا سریش رام ایک سال پہلے
اچانک مر گیا۔ اس کے بعد بابو جگ جیون رام بالکل ڈھ گئے۔ یہاں تک کہ جولائی 1986 کے پہلے
ہفتے میں ان کا انتقال ہو گیا۔

بہی موجودہ دنیا کی کل حقیقت ہے۔ آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو سخت
ڈپریشن کی حالت میں 1964 میں مرے۔ 1962 میں چین کے مقابلہ میں ہندستان کی شکست نے
ان کو اندر سے ختم کر دیا تھا اور اسی میں ان کا خاتمہ ہو گیا۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کو خود ان کے سیکورٹی
کے آدمیوں نے 1984 میں گولی مار کر ختم کر دیا۔ لال بہادر شاستری نے تاشقند (روس) میں
پاکستان کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کیا۔ یہ معاہدہ ان کی قومی آرزوؤں کے مطابق نہ تھا۔ چنانچہ
تاشقند ہی میں ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہیں وہ 11 جنوری 1966 کو ختم ہو گئے۔ ان کی صرف لاش
ہندوستان لائی جاسکی۔ تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے ہونے والے وزیر اعظم مرارجی دیسانی (پیدائش
1896) اور چرن سنگھ (پیدائش 1902) ہندستان میں سیاسی بے عزتی کا نشان بن کر رہ گئے۔ جگ
جیون رام ملک کے وزیر اعظم یا کم از کم صدر بننے کا خواب دیکھ رہے تھے اور آخر میں مکمل حسرت اور
یاس کے ساتھ انہیں دنیا کو چھوڑنا پڑا۔

کیسا عجیب ہے انسانی زندگی کا یہ انجام۔ مگر کیسا عجیب ہے وہ انسان جو ان کھلے کھلے واقعات
سے سبق نہیں لیتا۔ کامیابی اور ناکامی اس دنیا میں اضافی الفاظ ہیں۔ کامیاب وہ ہے جو آخرت میں
کامیاب ہو۔ کیونکہ اس دنیا میں کامیاب ہونا تو ممکن ہی نہیں۔

1976 میں جب میں نے الرسالہ نکالا تو ابتداءً لوگوں نے اس کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کیا۔ اس وقت لوگوں نے کہا کہ وحید الدین خاں کے اندر کسی کام کو کرنے کی صلاحیت نہیں۔ ان کا رسالہ چند ماہ نکلے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ بند ہو جائے گا۔

مگر الرسالہ چلتا رہا اور بڑھتا رہا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ان کی امیدوں کے خلاف الرسالہ برابر نکلتا جا رہا ہے تو انہوں نے دوسرا شوشہ تلاش کر لیا۔ اب انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ قذافی کے پیسے کا کرشمہ ہے۔ دشمن اسلام قذافی ان کی مدد کر رہا ہے۔ نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری مسلم دنیا میں یہ بات پھیلا دی گئی۔ اس جھوٹے پروپیگنڈے کا خاص مقصد یہ تھا کہ خلیجی ممالک مجھ سے متنفر ہو جائیں اور میری کوئی مالی مدد نہ کریں۔

مگر یہ مہم بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ دس سال کی مختصر مدت میں اللہ تعالیٰ نے اس مشن کو اتنا بڑھایا کہ فکری طور پر وہ تمام دوسرے افکار و نظریات پر غالب آ گیا۔ نام نہاد مسلم مفکرین سب کے سب نمبر 2 پر چلے گئے۔

اس طرح قذافی کا شوشہ عملاً بے فائدہ ہو گیا۔ اب ان حضرات کے زرخیز دماغ نے تیسرا شوشہ دریافت کر لیا۔ آج کل وہ نہایت استقلال کے ساتھ یہ مشہور کر رہے ہیں کہ یہ تو محض شخصی تماشاشا (one man show) ہے، یہ کوئی اجتماعی ادارہ نہیں۔ وحید الدین خاں کے مرتے ہی اپنے آپ یہ سارا ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔ اور اگر زندہ رہے گا تو محض ایک خاندانی مکتبہ کی صورت میں۔

یہ تیسرا پروپیگنڈا بھی نہایت تیزی سے ہر جگہ پھیلا دیا گیا ہے۔ تمام عربوں کے ذہن میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ یہ بات ڈالی جا رہی ہے۔ مگر ان نادانوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ اپنا یہ پرفریب پروپیگنڈا ساری دنیا کے کان میں ڈال دیں، مگر وہ اس کو خدا کے کان میں نہ ڈال سکیں گے اور یہی واقعہ میرے اطمینان کے لیے کافی ہے۔

31 جولائی 1986

امریکا کو موجودہ زمانے میں سائنس کے میدان میں دوسری قوموں پر برتری حاصل ہے۔ اس واقعہ کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ یہ برتری اس نے بہت کم وقت میں حاصل کی۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ اس نے ساری دنیا کے اعلیٰ ذہن کو اپنے ملک میں جمع کر لیا۔

امریکا نے ان سائنس دانوں کا خیر مقدم کیا جو دو عالمی جنگوں کے درمیانی زمانہ میں یورپ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں امریکا نے ان کے ساتھ پوری طرح فراخ دلی کا معاملہ کیا۔ ان سائنس دانوں کو شہریت کے حقوق دیے گئے۔ ان کے ساتھ یہ شرط نہیں رکھی گئی کہ وہ اپنا کام پورا کرنے کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جائیں، وغیرہ۔

ان سائنس دانوں کی مادری زبانیں دوسری تھیں۔ انہوں نے امریکا آ کر انگریزی سیکھی اور اس میں مہارت پیدا کی۔ امریکا میں ان کو اور ان کے خاندان کو پوری طرح ترقی کرنے کا موقع ملا۔

این ریکو فرمی (Enrico Fermi, d. 1954) ایک مشہور سائنس داں ہے۔ وہ روم میں 1901 میں پیدا ہوا۔ وہ نیوکلیئر ایج کے بانیوں میں سے سمجھا جاتا ہے۔ 1938 میں اس کو فزکس کا نوبل انعام ملا۔ اسی سال وہ امریکا چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسٹاک ہوم کی تقریب کے فوراً بعد اس نے یہ کیا کہ نوبل انعام کی رقم سے اپنا اور اپنے خاندان کا ٹکٹ خریدا اور امریکا کے لیے روانہ ہو گیا۔ امریکا میں ان سے کہا گیا کہ وہ ایٹمی ری ایکٹر چلائیں۔ اگرچہ بعض سیاسی وجوہ سے ان کو امریکی شہریت 1944 میں دی گئی۔ مگر امریکا میں داخل ہوتے ہی ان کو ہر قسم کے حقوق حاصل ہو گئے تھے۔

بہی اعلیٰ ظرفی ہر قسم کی ترقی کی اصل بنیاد ہے۔ ایک لفظ میں اس دنیا میں کامیابی کا اصول یہ ہے: جتنا بڑا دل، اتنی بڑی کامیابی۔

شکایت اور حقوق طلبی میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی

قابلیت میں اضافہ پر دھیان دیجیے — آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔

ایک قابل ذکر واقعہ

مولانا بلال احمد مدنی صاحب کا تعلق یوپی سے ہے۔ انھوں نے 31 مارچ 2026 کو الرسالہ آفس کے وائس ایچ پر درج ذیل سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے:

” کبھی کبھی ایک چھوٹا سا حادثہ معاشرے میں ایک بڑے فساد کا پیش خیمہ بن سکتا ہے، لیکن اگر اس نازک موڑ پر ردِ عمل (reaction) کے بجائے حکمت (wisdom) سے کام لیا جائے، تو بھڑکتی ہوئی آگ کو نہ صرف ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے بلکہ اسے محبت کے گلزار میں بھی بدلا جاسکتا ہے۔ ایسا ہی ایک سبق آموز واقعہ 10 جنوری 2011 کی ایک رات کو بنارس کے ایک محلہ میں پیش آیا۔ اس وقت مولانا وحید الدین صاحب کی باتوں نے میری درست رہنمائی کی اور ایک فرقہ وارانہ فساد ٹل گیا۔

میں اپنے مکان کی تعمیر کے سلسلے میں رات کے وقت ملبہ ہٹوا رہا تھا۔ اتفاقاً ملبہ لادنے والے ٹریکٹر نے پیچھے ہوتے وقت وہاں موجود ایک قدیم ”کالی جی مندر“ کی سیڑھی کو ٹکر مار دی، جس سے مندر کی سیڑھی ٹوٹ گئی۔ حادثہ مذہبی نوعیت کا ہونے کی بنا پر انتہائی حساس تھا۔ ڈرائیور خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا، لیکن میں نے نہ فرار کی راہ اختیار کی اور نہ ہی معاملے کو چھپانے کی کوشش کی۔ میں نے سوچا کہ جب مندر آنے والے لوگ اس منظر کو دیکھیں گے تو وہ اسے ”مندر پر حملہ“ قرار دے کر فرقہ وارانہ رنگ دے سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ رات کو اسی جگہ ٹھہرنا چاہیے۔ رات کے تین بجے تقریباً دو سو افراد پر مشتمل نوجوانوں کا ایک ہجوم انتہائی اشتعال میں شور مچاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں اس مشتعل ہجوم کے سامنے اکیلے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا، اور بڑے تحمل اور نرمی سے کہا: ”اس حادثے کا ذمہ دار میں ہوں۔ یہ گاڑی میرے کام کے لیے ہائر کی گئی تھی، اس لیے یہ میری غلطی ہے۔ آپ جو چاہیں سزا دیں، میں حاضر ہوں، اور اگر آپ موقع دیں تو میں صبح ہی اسے پہلے سے بہتر تعمیر کرا دوں گا۔“ یہ غلطی کا اعتراف اور معذرت خواہانہ انداز ایک ”اخلاقی ہم“ ثابت ہوا۔ ہجوم کا سارا اشتعال ایک لمحے میں سرد پڑ گیا۔ مجمع میں سے ایک آواز آئی: ”ارے! یہ تو مولانا بلال صاحب ہیں، بہت بھلے اور سچے انسان ہیں۔ ہمیں لگا مندر پر حملہ ہوا ہے، کوئی بات نہیں آپ اسے بنواد پیچھے

گا۔“ اور وہ مجمع جو خون بہانے آیا تھا، پُر امن طریقے سے واپس لوٹ گیا۔ اگلے دن مولانا نے اس سیرٹھی کی تعمیر پہلے سے بہتر طریقے سے کرا دی۔

مولانا وحید الدین خان صاحب اکثر فرماتے تھے کہ ”مسائل کے حل کی طاقت ٹکراؤ میں نہیں بلکہ اعتراف اور نرم روی میں ہے۔“ جب انسان اپنی غلطی تسلیم کر لیتا ہے تو وہ دوسرے فریق کی انا (ego) ختم کر دیتا ہے۔ سچے دل اور نرم انداز میں مانگی گئی معافی کسی بھی بڑے سے بڑے ہجوم کے اشتعال کو انسانی ہمدردی میں بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میرے ساتھ پیش آنے والا بنا رس کا یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ اگر ہم اشتعال کے بجائے حکمت کا راستہ اختیار کریں، تو ہم نہ صرف بڑے نقصانات سے بچ سکتے ہیں بلکہ لوگوں کے دلوں میں انسانیت اور سچائی کے لیے احترام بھی پیدا کر سکتے ہیں۔“

ماہنامہ الرسالہ: صحابی رسول حبیب بن خماشہ کا قول ہے: مَنْ لَا يَرْضَى بِالْقَلِيلِ مِمَّا يَأْتِي بِهِ السَّفِيهَةُ يَرْضَى بِالْكَثِيرِ (العجم الاوسط للطبرانی، اثر نمبر 2258)۔ یعنی جو شخص نادان کے چھوٹے شر کو برداشت نہ کرے، اس کو نادان کا بڑا شر برداشت کرنا پڑے گا۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر آپ فریقِ ثانی کی انا کو بھڑکانے کے بجائے ان کے ضمیر کو جگا نہیں تو وہ آپ کا دوست بن سکتا ہے۔ نرمی اور سمجھداری انسانی ضمیر کو جگانے کا طریقہ ہے۔ انسان کی انا میں نفرت اور غصے کے جذبات موجود ہوتے ہیں، لیکن وہ خوابیدہ (dormant) ہوتے ہیں۔ اس کو بیدار کرنا خود فریقِ ثانی کی طرف سے نہیں ہوتا، بلکہ اکثر ہماری طرف سے ہوتا ہے۔ ہم چاہیں تو اس کو سویا ہوا رہنے دیں، یا ردِ عمل کا طریقہ اختیار کر کے اسے بھڑکا دیں اور اپنے لیے پہلے سے زیادہ بڑا مسئلہ پیدا کر لیں۔

مولانا بلال مدنی صاحب نے نرمی کا طریقہ اختیار کر کے فریقِ ثانی کے ایگو کو بھڑکنے نہیں دیا، اور نتیجتاً ایک فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہوئے ٹل گیا۔ انھوں نے گویا فریقِ ثانی کے چھوٹے شر کو برداشت کیا، اس لیے انھیں بڑا شر برداشت کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ واقعہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ حالات کتنے ہی کشیدہ ہوں، آپ نرمی اور تواضع کا طریقہ اختیار کر کے اس کو نارمل کر سکتے ہیں، نفرت کے ماحول کو محبت اور امن کے ماحول میں تبدیل کر سکتے ہیں، اور یہ کوئی بزدلی نہیں، بلکہ سب سے بڑی بہادری ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — 288

- مولانا وحید الدین خاں صاحب کی معروف تفسیر قرآن، تذکیر القرآن کی پہلی چار سورتوں کا ترجمہ تمل زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کا ترجمہ ڈاکٹر سید رفیق باشا (سابق اسٹیشن ڈائریکٹر، دوردرشن) نے کیا ہے۔ اس کا اجرا 13 جنوری 2026 کو چنئی بک فیئر میں مسٹر جے موہن نے کیا، جو تمل زبان کے ممتاز رائٹرز ہیں۔ اجرا کے بعد مسٹر جے موہن نے مولانا وحید الدین خاں صاحب کی فکر اور علمی وراثت پر ایک نہایت اہم اور فکر انگیز خطاب کیا۔ وہ مولانا کے تصور امن، مثبت سوچ اور زندگی کے بارے میں ان کے حقیقت پسندانہ رویے سے بے حد متاثر ہیں۔ انہوں نے مولانا صاحب سے اپنے دیرینہ تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ 25 برسوں سے وہ انہیں جانتے ہیں۔ نیز یہ کہ 2001 میں مسٹر جے موہن نے مولانا کے مذہبی رواداری پر مبنی کئی مضامین تمل ماہنامہ ”Sol Pudhithu“ میں شائع کیے تھے، جب وہ میگزین کے نائب مدیر تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ مولانا صاحب کی تحریریں واقعی غیر معمولی ہیں اور قاری کو بار بار پڑھنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ تذکیر القرآن کے تمل ترجمے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایسی قرآنی تفسیر ہر دور کے قارئین کے لیے ضروری ہے۔ اپنے خطاب کے اختتام پر انہوں نے کہا کہ وہ دنیا بھر میں موجود مولانا کے لاکھوں شاگردوں کی فہرست میں خود کو بھی شامل پاتے ہیں جنہوں نے ان کے افکار سے روشنی حاصل کی ہے۔ اس تقریب میں مسلم علما کے علاوہ مختلف مذاہب اور افکار سے تعلق رکھنے والی کئی ممتاز شخصیات نے بھی شرکت کی۔ تذکیر القرآن کے تراجم تمل زبان کے علاوہ کئی دیگر زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں، مثلاً عربی، ہندی، تیلگو، انگریزی، سندھی اور تھائی، وغیرہ۔ ان کو سی پی ایس انٹرنیشنل کی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے۔
- امریکا کی Marquette University کے تھیالوجی کے طلباء کے ایک گروپ نے 3 جنوری 2026 کو سی پی ایس انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی کا دورہ کیا، جہاں اسلام اور امن کے موضوع پر ایک انٹرایکٹیو نشست منعقد ہوئی، جس میں اسلام میں بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کی اہمیت پر گفتگو ہوئی۔ پروگرام کے اختتام پر تمام مہمانوں کو انگریزی ترجمہ قرآن اور دیگر تعارف اسلام پر مبنی لٹریچر دیے گئے۔
- نیشنل میڈیکل کالج سہارنپور میں 1 جنوری 2026 کو مولانا وحید الدین خاں صاحب کے 101 واں یوم پیدائش کی مناسبت سے ایک پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسلم خاں اور معروف آئی سرجن ڈاکٹر سفینہ تبسم نے خصوصی طور پر مولانا صاحب کی امن اور روحانیت پر مبنی تعلیمات کو اپنانے پر زور دیا۔ پروگرام میں جناب مشاہد علی صدیقی اور مسٹر راہل کا خصوصی تعاون رہا۔ تمام شرکاء نے مولانا صاحب کے

لیے جنت میں اعلیٰ مقام اور دنیا میں ان جیسے امن پسند ذہن کے فروغ کے لیے دعا کی۔ اس کے بعد 26 جنوری 2026 کو بھارتی آئین کے 77 ویں یوم جمہوریہ کی تقریب نیشنل میڈیکل کالج، سہارنپور میں منعقد ہوئی۔ پروگرام کے مہمان خصوصی سابق رکن پارلیمنٹ جناب فضل الرحمن، جناب مانگے رام، ڈاکٹر سفینہ تبسم اور پرنسپل ڈاکٹر اسلم نے مشترکہ طور پر ترنگا لہرا کر قومی یکجہتی کا پیغام دیا گیا۔ اس موقع پر امن کے قیام اور بھارت کو ایک مضبوط قوم بنانے کے لیے اپنی فکری و روحانی خدمات انجام دینے والے پدم و بھوشن مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابیں بطور خاص مہمان خصوصی اور دیگر معزز مہمانوں کو تحفے کے طور پر پیش کی گئیں۔

● سی پی ایس انٹرنیشنل نئی دہلی کے ٹرسٹی ڈاکٹر رجت ملہوترا کو ہنری مارٹن انسٹیٹیوٹ کی جانب سے 12 فروری 2026 کو حیدرآباد میں منعقد کانوکیشن تقریب میں ڈاکٹر آف لٹریچر (اعزازی) کی ڈگری سے نوازا گیا۔ یہ اعزازی پی ایس انٹرنیشنل اور ان کے بھی خواہوں کے لیے اس بات کی حوصلہ افزائی ہے کہ وہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کی علمی و فکری میراث کو پوری لگن کے ساتھ آگے بڑھاتے رہیں۔

● 21 فروری 2026 کی شام، چینی کے بدھرم ادارے Tripitaka Tamil Foundation کے زیر اہتمام بدھرم کی دو کتابوں کی تقریب اجرا منعقد ہوئی۔ یہ کتابیں گوتم بدھ کی حیات اور تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ یہ تقریب چینی کے Anna Centenary Library کے میننگ ہال میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں بطور مہمان خصوصی تھائی لینڈ کے قونصل جنرل رچا اریبارگ (Racha Aribarg) اور سری لنکا کے ڈپٹی ہائی کمشنر جناب گنیساناتھن گیتیسورن (Ganesanathan Geathiswaran) نے شرکت فرمائی۔ اس موقع پر سی پی ایس چینی ٹیم کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ جناب فیض قادری اور خطیب اسرار الحسن عمری نے بطور مہمان شرکت کی۔ ان کتابوں کی پہلی کاپی سری لنکا کے ڈپٹی ہائی کمشنر صاحب نے جاری کی، جسے جناب فیض قادری صاحب نے حاصل کیا۔ تقریب کے اختتام پر بیرون ملک سے تشریف لائے دونوں معزز مہمانوں کو سی پی ایس کا لٹریچر بطور تحفہ پیش کیا گیا، جسے انہوں نے خوش دلی سے قبول فرمایا۔ اس تقریب میں شہر کی متعدد اہم شخصیات بھی شریک تھیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بدھمت ادارے کی تقریبات میں سی پی ایس چینی ٹیم پچھلے کئی سالوں سے باقاعدگی کے ساتھ شرکت کر رہی ہے۔ (کلوندیم احمد، آمبور، تامل ناڈو)

● سی پی ایس راجپور کی جانب سے 11 مارچ 2026 کو رمضان کی مناسبت سے بین المذاہب دعوتِ افطار کا اہتمام کیا گیا۔ راجپور کی چودھری کالونی میں واقع محبوبیہ مسجد میں منعقدہ افطار کے موقع پر دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے ساٹھ افراد کو مدعو کیا گیا۔ افطار سے قبل آصف ماسٹر اور ڈاکٹر رفیق مدگل نے اسلام کا پیغام اور روزے کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ افطار کے بعد دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے تمام مہمانوں نے

نماز کا براہ راست مشاہدہ کیا۔ دعا کے بعد سی پی ایس رانچور چیپٹر کے اراکین، مسٹر ابوالحسن اور مسٹر ظہیر الدین خواجہ نے مہمانوں کے درمیان بطور تحفہ کنز جمد قرآن کے نسخے تقسیم کیے۔

- 13 اپریل 2026 کو سی پی ایس یو ایس اے سینٹر میں ایک پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام میں زیادہ تر شرکاء بارورڈ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز تھے، جو اپنی پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ بہت سے افراد پہلے ہی مولانا وحید الدین خان صاحب سے واقف تھے اور سینٹر کا دورہ کر کے بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے اپنے لیے اور بارورڈ میں اپنے ساتھیوں کے لیے کتابیں بھی حاصل کیں۔ شرکاء نے آئندہ بھی رابطہ برقرار رکھنے اور مزید پروگراموں و نشستوں میں شرکت کے لیے اپنی دلچسپی ظاہر کی۔ (مسٹر اسد پرویز، سی پی ایس، امریکا)
- 29-30 مارچ 2026 کو نئی دہلی میں ”مولانا وحید الدین خاں: دور جدید میں امن کے سفیر“ کے عنوان سے سی پی ایس انٹرنیشنل کی پہلی علما کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس میں ملک کے مختلف حصوں سے علما نے شرکت کی۔ اس موقع پر تمام لوگوں نے دین کے تعارف کے لیے امن کی اہمیت کو اجاگر کیا، اور دعوت و امن کے میدان میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا، اور یہ عہد کیا کہ مولانا صاحب نے جس طرح دعوت اور امن کے لیے کام کیا ہے، وہ بھی اسی طرح امن اور دعوت کے کام کو آگے بڑھانے کا کام کریں گے۔ اس موقع پر مولانا صاحب کی چھ کتابیں ریلیز کی گئیں، علما اور دینی مدارس (اردو)، پیغمبر انقلاب (ہندی) آخری سفر (پنجابی)، مکانة المرأة فی الإسلام، القرآن الکریم المعجزة الخالدة، تہذیب النفس سر الفوز فی الحیاة (عربی)۔ یہ تمام کتابیں سی پی ایس انٹرنیشنل کی ویب سائٹ سے ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ سی پی ایس انٹرنیشنل کا قرآن ایپ (ApplyQuran) بھی لانچ ہوا، اس ایپ کو حسب ذیل QR کوڈ سے ڈاؤنلوڈ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب کی

کتابوں کے مطالعہ کے لیے یہ

کوڈ اسکن کریں



ApplyQuran

ایپ گوگل پلے سٹور سے ڈاؤنلوڈ

کرنے کے لیے QR کوڈ اسکن کریں



चाबी को छल्ले में डालना भूल गया। इसकी चाबी अलग है।" इसके बाद उन्होंने जेब से दूसरी चाबी निकाली और पल भर में ताला खुल गया।

जब समय बदलता है तो यही हाल उन लोगों का हो जाता है जो पुराने समय की योग्यता के आधार पर आज की दुनिया में अपनी कीमत वसूल करना चाहते हैं। नए ज़माने में ज़िंदगी के दरवाज़ों के सारे ताले बदल चुके होते हैं। लेकिन वे पुरानी चाबियों का गुच्छा लिए हुए नए तालों पर ज़ोर लगाते रहते हैं। और जब उनकी पुरानी चाबियों से नए ताले नहीं खुलते तो कभी ताला बनाने वाले पर और कभी पूरे माहौल पर नाराज़ होते हैं। जबकि जब ताले बदल चुके हों तो यह कभी नहीं हो सकता कि पुरानी चाबियों से नए ताले खुल जायें।

वास्तविकता के दौर में जज़्बाती भाषण और लेखन, योग्यता के आधार पर हक़ पाने के समय में आरक्षण की मांगें, निर्माणात्मक स्थिरता के ज़रिए आगे बढ़ने के दौर में जलसों और जुलूसों के माध्यम से क्रौम का भविष्य तलाशने की कोशिश, सामाजिक आधारों की अहमियत के समय में राजनीतिक सौदेबाज़ी के ज़रिए तरक्की की योजनाएँ—ये सब इसी की मिसालें हैं। यह पुराने मापदंडों के सहारे आज की दुनिया से अपने लिए ज़िंदगी का हक़ हासिल करने की कोशिश है, जो कभी सफल नहीं हो सकती। ऐसे लोगों का अंजाम आज की दुनिया में यही होता है कि वे नफिसयाती (मनोवैज्ञानिक) तौर से बीमार होकर रह जाते हैं। जो कुछ उन्हें अधिकार के आधार पर नहीं मिला, उसे वे अत्याचार का नतीजा मानते हैं—और फिर हमेशा के लिए नकारात्मक सोच के शिकार हो जाते हैं।

एक ट्रेन छूट जाए तो आदमी सफ़र करने के लिए दूसरी ट्रेन पा लेता है, मगर अक्सर लोग इस हक़ीक़त को उस वक़्त भूल जाते हैं जबकि ज़िन्दगी की दौड़ में एक मौक़ा उनके हाथ से निकल गया हो।

और अधिवेशनों की बात सोचने लगता है। उसे ऐसा लगता है कि लोगों को इकट्ठा करके जोशीली तक्ररिं की जाएं, प्रस्ताव पास किए जाएं, वगैरह।

मगर यह समस्या का हल नहीं है। यह तो यूँ है कि वह लक्षणों पर मेहनत कर रहा है, जबकि असली हल यह है कि कारण पर मेहनत की जाए। ज़िंदगी में अक्सर ऐसा होता है कि समस्या कहीं और नज़र आती है, और उसका हल कहीं और छुपा होता है। उदाहरण के लिए, अगर क्रौम के अंदर एकता नहीं है तो इसकी वजह यह होगी कि व्यक्तियों में एकता नहीं है। ऐसी स्थिति में आप "एकता सम्मेलन" करके लोगों के बीच एकता नहीं पैदा कर सकते। पहले व्यक्ति के स्तर पर एकता पैदा कीजिए, उसके बाद क्रौम के स्तर पर अपने-आप एकता पैदा हो जाएगी।

इस संसार का नियम है कि जो "फल" पर मेहनत करता है, उसे फल नहीं मिलता। फल सिर्फ़ उसी को मिलता है जिसने "बीज" पर मेहनत करने का सबूत दिया हो। (अल-रिसाला, अगस्त 1986)

और ताला खुल गया

उसकी नाकाम कोशिश अब झुंझलाहट में बदल चुकी थी। वह काफ़ी देर से ताले पर ज़ोर लगा रहा था। "चाबी तो देखने में सही है। ज़रूर ताले के अंदर कोई ख़राबी है जिसकी वजह से ताला खुल नहीं रहा है," उसने सोचा। उसका गुस्सा अब इस हद तक पहुँच चुका था कि अगला क़दम बस यही रह गया था कि ताला खोलने के लिए वह चाबी की जगह हथौड़े का इस्तेमाल शुरू कर दे।

इतने में उसके मेज़बान दोस्त अहमद साहब आ गए। "क्या ताला नहीं खुल रहा है?" उन्होंने चाबी अपने हाथ में लेते हुए कहा। "अरे, आप चाबी ग़लत लगा रहे थे। दरअसल, आज ही मैंने इसका ताला बदल दिया है। लेकिन मैं नई

इसमें मोमिन और ग़ैर-मोमिन के बीच कोई फ़र्क नहीं किया गया है। जो भी बंदा किसी नाज़ुक घड़ी में दिल से अपने रब को पुकारेगा, वह उसकी तरफ़ से जवाब पाएगा।

इस तरह की घटनाएँ एक तरफ़ खुदा के वुजूद की ज़िंदा सुबूत हैं, और दूसरी तरफ़ यह भी बताती हैं कि इस दुनिया में इंसान तन्हा नहीं है — उसका एक पासवान (रक्षक) है, जो हर मुश्किल वक़्त में उसकी मदद करता है।

व्यक्ति के स्तर पर

एक व्यक्ति साइकिल पर यात्रा कर रहा था। अचानक उसकी ब्रेक जाम हो गई। वह उतरकर साइकिल मिस्त्री के पास गया। उस साइकिल वाले का ख्याल था कि जिस जगह पर ब्रेक जाम हुई है, मिस्त्री वहीं हाथ लगाएगा और उसे ठीक कर देगा। मगर मिस्त्री ने हथौड़ी उठाई और बिल्कुल दूसरी जगह ठोकना शुरू कर दिया। यात्री अभी अपनी हैरानी ज़ाहिर भी नहीं कर पाया था कि मिस्त्री ने कहा, "बस ठीक है, ले जाइए।" अगले ही पल साइकिल अपने सवार को लेकर फिर से सड़क पर दौड़ रही थी।

ठीक यही मामला इंसानी ज़िंदगी का भी है। अक्सर ऐसा होता है कि आदमी ज़ाहिरी कारणों को देखकर समझ लेता है कि खराबी यहीं है। वह उसी जगह पर ज़ोर आजमाना शुरू कर देता है, मगर खराबी दूर नहीं होती। इसकी वजह यह है कि खराबी की असली जड़ कहीं और होती है, और जब तक असली जड़ को ठीक न किया जाए, तब तक खराबी दूर नहीं हो सकती।

उदाहरण के तौर पर, अगर किसी गिरोह के अंदर एकता नहीं है, उस पर जुल्म हो रहा है, लोग आपसी मतभेदों की वजह से बाहर वालों से मिल जाते हैं, उनके पास कोई साज़ा आवाज़ नहीं होती, वगैरह। इन हालात को देखकर किसी व्यक्ति के अंदर कुछ करने का ज़ब्बा पैदा होता है और वह तुरंत जलसों

एन्साइक्लोपीडिया ब्रिटैनिका के अनुसार, भारत में अपने आखिरी दिनों में ह्वेन त्सांग के साथ एक हादसा पेश आया। एक यात्रा के दौरान कुछ समुद्री डाकुओं ने उसे पकड़ लिया। ये लोग हिन्दू देवी दुर्गा के पुजारी थे। उन्होंने ह्वेन त्सांग को अपनी देवी के नाम पर बलिदान करने का इरादा किया।

ह्वेन त्सांग ने बहुत विरोध किया। उसने कहा कि वह एक बौद्ध साधु है और केवल सत्य की तलाश में निकला है। लेकिन डाकुओं ने उसकी एक न सुनी। ऐसा प्रतीत होने लगा कि अब उसकी मौत यक्रीनी है।

उस वक़्त वह नाव में सवार था। आखिर में वह ख़ामोश हो गया और ध्यान व प्रार्थना में लीन हो गया। जब वह पूरी तरह ध्यान और प्रार्थना में मग्न था, समुद्र में एक भयंकर तूफ़ान उठ खड़ा हुआ। लहरों ने नाव को पूरी तरह घेर लिया।

यह दृश्य देखकर डाकू इस क्रूर डर गए कि उन्होंने ह्वेन त्सांग को छोड़ दिया और शर्मिदा होकर उससे माफ़ी माँगने लगे।

जैसा कि वर्णन किया गया है:

"While he was absorbed in meditation, a violent storm arose that buffeted the boat. The pirates were so terrified that they freed the holy monk and asked for forgiveness and repentance." (8/1126)

चीनी यात्री के साथ जो यह वाक़या पेश आया, वह बिल्कुल कुरआन के इस बयान के मुताबिक़ है:

"कौन है जो बेबस की पुकार को सुनता है और उसके दुख को दूर कर देता है?" (27:62)

एक रिवायत के मुताबिक, उस समय वे बीमार भी थे।

हज़रत अब्दुल्लाह बिन रवाहा रसूलुल्लाह (सल्ल०) के सहाबा में से थे। इस महान सहाबी की यह घटना हमें बताती है कि दीन में जिस चीज़ को "ज़िक्र" कहा गया है, वह असल में क्या है।

ज़िक्र केवल जुबान से अल्फ़ाज़ दोहराने का नाम नहीं, बल्कि वह एक अंदरूनी तूफ़ान होता है, जो एक बंदे के दिल में उस वक़्त उठता है जब वह अपने रब को सच्चे दिल से याद करता है।

जो व्यक्ति अल्लाह पर सच्चा ईमान रखता हो, जब वह उसे याद करता है, तो उसकी अज़मत से उसका दिल कांप उठता है, और उसके सामने पेशी का ख़याल उसे हिला देता है। उस वक़्त उसकी दिली हालत खुद-बखुद शब्दों के रूप में बाहर निकलने लगती है — यही असली ज़िक्र है।

खुदा का ज़िक्र असल में खुदा को अपने दिल में उतारने का नाम है — ऐसे अल्लाह को, जिसकी महिमा को पहाड़ भी सहन नहीं कर सकते—उस तूफ़ानी छण में, जो रब्बानी शब्द इंसान की जुबान से निकलते हैं, वही ज़िक्र कहलाते हैं।

ज़िक्र का मक़सद कुछ शब्दों को पा लेना नहीं है, बल्कि खुदा को पा लेना है।

खुदा की याद या उससे दुआ, इंसान और खुदा के बीच संपर्क का ज़रिया है। जब इंसान दिल से पुकारता है, उसी वक़्त खुदा की तरफ़ से उसका जवाब भी आ जाता है।

ह्वेन त्सांग (Hsuan Tsang) एक चीनी बौद्ध साधु था। उसका जन्म 602 ईस्वी में हुआ और 664 में उसका देहांत हुआ। वह 629 ईस्वी में चीन से भारत की यात्रा पर निकला। भारत के बारे में उसका यात्रा विवरण ऐतिहासिक दृष्टि से बहुत अहम माना जाता है।

जरूरत नहीं। ऐसा गिरोह खुद अपने ही हाथों अपने को खत्म कर लेता है। कोई प्रतिद्वंद्वी जब सामने आता है तो आदमी जोश में आकर उससे लड़ने लगता है। नतीजा यह होता है कि पहले ही चरण में वह प्रतिद्वंद्वी की ताकत का निशाना बन जाता है। अगर आदमी सब्र और सूझबूझ से काम ले और मुक्काबले के पहले ही चरण में प्रतिद्वंद्वी के वार को खाली जाने दे तो बहुत जल्द ऐसा होगा कि प्रतिद्वंद्वी खुद अपनी कार्रवाइयों के नतीजे में अपने को शस्त्रहीन कर चुका होगा। याद रखिए, कोई भी शस्त्र जो आपके मुक्काबले में आता है उसके पास हमेशा 'तीन' ही गोलियां होती है। अनगिनत गोलियां किसी के पास नहीं होतीं। अगर आप यह होशियारी दिखाएं कि मुक्काबले की शुरुआत में किसी तरह अपने को निशाने से हटा लें तो इसके बाद निश्चित रूप से ऐसा होगा कि दुश्मन अपनी 'तीन गोलियों' को खत्म करके खाली हाथ हो चुका होगा। अब ज्यादा बेहतर तौर पर वह वक्त आ जाएगा कि आप उसको हर देश और हर मुल्क के मुसलमान भी ऐसा ही करते हैं कर सकें। यह कामयाबी हर प्रतिद्वंद्वी और हर शत्रु के ऊपर हासिल की जा सकती है। बशर्ते कि मुक्काबले के दौरान आदमी अपने होशो-हवास न खोए।

खुदा का जिक्र

कैस बिन अबी हाजिम से रिवायत है कि हज़रत अब्दुल्लाह बिन रवाहा (रज़ियल्लाहु अन्हु) अपनी बीवी की गोद में सिर रखे हुए थे कि अचानक वे रोने लगे। उनकी बीवी भी उनके साथ रोने लगीं। उन्होंने पूछा, "तुम क्यों रोई?" बीवी ने कहा, "मैंने आपको रोते देखा तो मैं भी रोने लगी।"

अब्दुल्लाह बिन रवाहा ने कहा, "मुझे अल्लाह तआला का यह कथन याद आ गया – 'तुम में से हर एक को जहन्नम से गुज़रना है' (कुरआन, 19:71), तो मुझे नहीं मालूम कि मैं उससे बच सकूंगा या नहीं।" (हयातुस सहाबा, खण्ड 4, पृष्ठ 57)

मुजरिम के पास तीन गोलियां थीं। किशन चंद ने बहुत होशियारी के साथ उसकी तीनों गोलियां खाली करा दीं। फिर मुजरिम को उन्होंने पकड़ लिया (हिन्दुस्तान टाइम्स, सितम्बर 7, 1980)।

इस छोटी-सी घटना में बहुत बड़ा सबक है। ज्यादातर प्रतिद्वंद्वी से मुक्काबले का बेहतरीन तरीका यह होता है कि शुरू में उसके वार को खाली कर दिया जाए, यहां तक कि उसके हथियार की 'तीन गोलियां' खत्म हो जाएं। फिर उससे मुक्काबला करना निहायत आसान होगा। मसलन एक व्यक्ति आपसे ज्यादा ताकतवर है और वह आपकी किसी बात पर उत्तेजित हो जाता है। जब वह आप पर बिगड़ना शुरू करे तो पहले आप उसके वार को खाली करने की कोशिश करें, यानी बिल्कुल चुप होकर उसकी बात सुनते रहें, यहां तक कि जब उसके शब्द खत्म हो जाएं और उसकी भड़ास निकल जाए उस वक़्त गंभीरता के साथ स्थिति के बारे में उसको बताएं। अगर आप शुरू में इस क्रिस्म का सब्र दिखाएं तो आप निश्चित रूप से सफल रहेंगे क्योंकि अब वह अपने हथियार की तीन गोलियां खत्म कर चुका है और अब बहुत आसानी के साथ उसका मुक्काबला किया जा सकता है।

इसी तरह कुछ लोग हैं, जो आपके खिलाफ़ एकजुट होकर आ गए हैं और आपको मिटा देना चाहते हैं। गौर कीजिए तो यह एकजुटता सिर्फ़ इस आधार पर होगी कि आप उनके सामने उनके प्रतिद्वंद्वी बनकर खड़े हुए हैं। अगर आप सूझ-बूझ का तरीका इस्तिहार करें और कुछ देर के लिए अपने को निशाने से हटा दें तो आप देखेंगे कि उनकी एकजुटता टूट रही है। उनकी एकजुटता के हथियार की गोली आपका प्रतिद्वंद्वी बनकर खड़ा होना था। जब आपने अपने को प्रतिद्वंद्वी के मुक़ाम से हटा दिया तो जैसे आपने उनकी तीनों गोलियां खाली करा दीं। अब वे अपने आप बिखर जाएंगे और जो गिरोह मतभेद और फूट में पड़ जाए उसको खत्म करने के लिए कुछ करने की

(peaceful) दुनिया बन जाएगी। उस समय शांति का स्थान सामान्य (rule) का होगा और हिंसा का स्थान केवल अपवाद (exception) का।

सब्र का हथियार

6 सितंबर 1980 की बात है। श्रीमती कमलेश (22 साल) शाहदरा (दिल्ली) की एक सड़क पर चल रही थीं। उनके गले में सोने की जंजीर थी। अचानक अशोक नाम का एक व्यक्ति जिसकी उम्र 25 साल थी झपटा और श्रीमती कमलेश की जंजीर खींच कर भागा। पुलिस कांस्टेबिल किशन चंद त्यागी (42 साल) उस वक्रत ड्यूटी पर घूम रहे थे। किसी ने उनको इस घटना की सूचना दी। वह तलाश करते हुए एक वाल्मीकि मंदिर में पहुंचे, जहां मुजरिम मौजूद था। पुलिस की वर्दी देखते ही वह उठ खड़ा हुआ। किशन चंद ने उसका पीछा किया। मुजरिम के पास एक रिवाल्वर था। उसने फ़ायर किया तो उसकी गोली किशन चंद की आंख के नीचे उनके चहरे और गर्दन को ज़ख्मी करती हुई गुजर गई। उन्होंने चिल्ला कर कहा, “एक बार तूने मुझे मार दिया, पर दोबारा तू नहीं मार सकता। मुझे मालूम नहीं था कि तेरे पास रिवाल्वर है।” अब वह चौकन्ना हो गए। मुजरिम ने दोबारा गोली चलाई। पर हर बार वह निहायत फ़ुर्ती के साथ बैठ गया और उसके वार को खाली कर दिया। किशन चंद बिना किसी डर के अकेले मुजरिम का पीछे करते रहे, जबकि ‘दुश्मन’ के पास रिवाल्वर था और उनके अपने पास लाठी भी नहीं थी। दौड़ते-दौड़ते आखिरकार साढ़े चार फुट की एक चारदीवारी सामने आ गई। मुजरिम उस पर कूद गया। किशन चंद ने भी फौरन छलांग लगाई और दूसरी तरफ़ जाकर उसको पकड़ लिया।

“एक सशस्त्र मुजरिम को दौड़ाते हुए आपको डर नहीं लगा?” एक अखबार के संवाददाता ने किशन चंद से पूछा। “नहीं।” उन्होंने जवाब दिया, “मैं जानता था कि जब उसका रिवाल्वर खाली हो चुका होगा तो मैं उसको पकड़ लूंगा।”

अर्थात्, पूरी धरती मेरे लिए और मेरी उम्मत के लिए मस्जिद बना दी गई है।

इस हदीस में 'मस्जिद' का शब्द प्रतीकात्मक अर्थ में आया है। इसका मतलब यह है कि मेरे बाद इतिहास में एक ऐसा दौर आने वाला है जो पूर्ण धार्मिक स्वतंत्रता (religious freedom) का युग होगा। आस्थावान लोग स्वतंत्र होंगे कि वे धरती के जिस हिस्से में चाहें धार्मिक गतिविधियाँ कर सकें, चाहे वह इबादत की गतिविधि हो या दीन की शिक्षा को लोगों तक पहुँचाने की गतिविधि।

वर्तमान युग में पैग़म्बर-ए-इस्लाम की यह भविष्यवाणी पूरी तरह सत्य साबित हो चुकी है। आज की दुनिया में आस्थावान लोग हर धार्मिक गतिविधि के लिए स्वतंत्र हैं। अब केवल एक गतिविधि वर्जित है, और वह है धर्म के नाम पर हिंसा। हिंसा का बड़ा रूप युद्ध है और हिंसा का छोटा रूप यह है कि आप दूसरों के लिए समस्या (problem) बन जाएँ।

'पूरी धरती मस्जिद बन जाएगी' का अर्थ यह है कि पूरी धरती और उस पर रहने वाले सभी लोग व्यवहारिक रूप से धर्म के समर्थक (supporter) बन जाएँगे। दुनिया की सभी जातियाँ या तो धर्म की समर्थक बन जाएँगी या कम से कम तटस्थ (indifferent)। इक्कीसवीं सदी व्यावहारिक रूप से इसी प्रकार की सदी है।

आज जो लोग नफ़रत और हिंसा में जी रहे हैं, वे यह घोषणा कर रहे हैं कि वे हर दृष्टि से अनभिज्ञ हैं — न तो वे समय की परिस्थितियों से वाकिफ़ हैं और न ही अपने पैग़म्बर की बताई हुई बातों से।

हदीस में 'मस्जिद' के अलावा दूसरा शब्द 'तहूर' (पवित्रता) आया है। पवित्रता का एक अर्थ यह भी है कि दुनिया एक सिद्धांत के रूप में शांति-प्रिय

की मानसिकता पूरी तरह पैदा हो जाए तो वह उसे पूर्ण रूप से शांति-प्रिय बना देती है। इसके विपरीत, जिन लोगों में संतोष की भावना नहीं होती, वे अपनी स्थिति से असंतुष्ट रहते हैं और अंततः झुंझलाहट में आकर हिंसक गतिविधियाँ शुरू कर देते हैं ताकि जो चीज वे शांतिपूर्वक हासिल नहीं कर सके, उसे हिंसा के ज़रिए हासिल कर लें।

असल बात यह है कि संतोष से इंसान के अंदर शांति का स्वभाव पैदा होता है, और असंतोष से हिंसा का। संतोष इंसान को यह एहसास देता है कि वह पहले से ही बहुत कुछ पा चुका है, और जो खुद को पाया हुआ समझता है, वह कभी झुंझलाहट या हिंसा का शिकार नहीं होता।

इसके विपरीत, वह इंसान जो असंतोष की मानसिकता में ग्रस्त हो, वह हमेशा हीनभावना का शिकार रहेगा। उसका यह एहसास उसे लगातार उकसाता रहेगा कि जो कुछ उसने नहीं पाया, उसे किसी भी तरह प्राप्त करने की कोशिश करो। यदि वह देखता है कि वह उस चीज को शांतिपूर्ण तरीके से नहीं पा सकता, तो वह हिंसक तरीकों का सहारा लेकर उसे हासिल करना चाहेगा।

वह उन सभी लोगों को अपना दुश्मन समझेगा, जिन्हें वह अपनी इच्छा की राह में रुकावट समझता है। वह उन लोगों से नफ़रत करेगा, उनके खिलाफ़ हथियार जमा करेगा। जबकि हक़ीक़त यह है कि यह सब कुछ इसलिए होगा क्योंकि वह अल्लाह द्वारा दिए गए पर राज़ी नहीं हो सका, वह संतोष के बजाय असंतोष का शिकार हो गया।

पूरी धरती मस्जिद बन गई

मस्जिद के संदर्भ में एक रिवायत हदीस की विभिन्न किताबों में आई है। एक रिवायत के शब्द इस प्रकार हैं: "جعلت الأرض كلها لي ولأمتي مسجداً وطهوراً" (मुस्नद अहमद, हदीस संख्या 22137)

उन्होंने आपको बहुत तकलीफें पहुँचाईं यहां तक कि आपको मार डालने की कोशिशें होने लगीं। जब यह नौबत आ गई तो आप मक्का छोड़ कर मदीना चले गए।

उस समय स्थिति इतनी खराब थी कि मक्का से निकल कर सीधे मदीना जाना खतरे से खाली न था। इसलिए आप जब मक्का छोड़ कर निकले तो तीन दिन तक आप सौर नामक गुफ़ा में छुपे रहे, जो एक कठिन रास्ते वाले पहाड़ के ऊपर तंग जगह पर स्थित थी। फिर भी आपके दुश्मन आपको खोजते हुए वहां भी पहुंच गए। आप अपने दोस्त अबू बक्र के साथ गुफ़ा में थे और आपके दुश्मन तलवारों लिए हुए गुफ़ा के इतने पास खड़े थे कि आप उनके पैरों को देख सकते थे। मौत आपके बिल्कुल करीब पहुंच चुकी थी। हज़रत अबू बक्र यह देख कर बहुत घबराए। उन्होंने रसूलुल्लाह (सल्ल०) से कहा कि वे तो यहां भी आ गए। आपने बहुत इत्मीनान के साथ जवाब दिया, “ऐ अबू बक्र, उन दो के बारे में तुम्हारा क्या विचार है, जिनका तीसरा अल्लाह हो?” (सहीह अल-बुखारी, हदीस संख्या 4663)

यह वाक्य तवक्कुल (अल्लाह पर भरोसा) और विश्वास का सर्वश्रेष्ठ नमूना है। इस वाक्य में इन्सान ‘तवक्कुल’ के सर्वोच्च और अंतिम शिखर पर नज़र आता है।

कट्टरता का कारण असंतोष

पैगम्बर-ए-इस्लाम (सल्लल्लाहु अलैहि व सल्लम) की एक हदीस इन शब्दों में आई है: "فد افلح من أسلم ورزق كفافاً وقلعه الله بما آتاه" (सहीह मुस्लिम, हदीस संख्या 1054)

अर्थात्, वह व्यक्ति सफल हुआ जिसने इस्लाम अपनाया, जिसे आवश्यकता के अनुसार रोज़ी मिली और जो उस पर संतुष्ट हो गया जो अल्लाह ने उसे दिया।

इस हदीस में संतोष (क्रनाअत) का उल्लेख है। अगर किसी के अंदर संतोष

व्यापारियों ने कहा, “दस दिरहम पर चौदह दिरहमा।” हज़रत उस्मान ने कहा, “मुझे इससे ज़्यादा क्रीमत मिल रही है।”

उन्होंने कहा, “अच्छा, दस दिरहम पर पन्द्रह दिरहमा।” हज़रत उस्मान ने कहा कि उन्हें इससे भी ज़्यादा मिल रहा है। व्यापारियों ने कहा, “कौन आपको इससे ज़्यादा दे रहा है, जबकि मदीने के जितने “व्यापारी हैं सब यहां जमा हैं।”

हज़रत उस्मान ने कहा, “मुझे हर एक दिरहम के बदले दस दिरहम मिल रहा है। क्या तुम मुझे इससे ज़्यादा दे सकते हो?” उन्होंने कहा, “नहीं।”

हज़रत उस्मान बोले, “अल्लाह ने अपनी किताब में फ़रमाया है कि जो शख्स नेकी लेकर आएगा तो उसके लिए इसका दस गुना बदला है। (सूर:अल-अनआम, 160) तो ऐ मदीने के व्यापारियो, गवाह रहो कि मैंने यह तमाम खाने का सामान अल्लाह के लिए शहर के ज़रूरतमंदों पर सदक़ा (दान) कर दिया।” (अल-शरीअह, अल-आजुरी, खण्ड 3, पृष्ठ 2012)

यह घटना खुदा के वादे पर यक्रीन की बेहतरीन मिसाल है। खुदा पर ईमान (विश्वास) आदमी में इसी तरह का यक्रीन और विश्वास पैदा करता है। और जिस आदमी में इस तरह का यक्रीन और विश्वास पैदा हो जाए वह स्वार्थ और लाभ-हानि से ऊपर उठ जाता है। उसके हौसले इतने बुलंद हो जाते हैं कि बड़ी से बड़ी कुर्बानी भी उसके लिए मुश्किल नहीं लगती।

विश्वास और तवक्कुल

पैग़म्बरे इस्लाम (सल्ल०) मक्का में पैदा हुए। आपने अपनी तबलीग़ा (इस्लाम का संदेश लोगों तक पहुँचाने) के आरम्भिक बारह साल इसी शहर में गुज़ारे। उस ज़माने में मक्का में शिर्क (बहुदेववाद) को मानने वालों का ज़ोर और बोल-बाला था।

इस घटना में इंसान खुदा के साथ अपनी बन्दगी के आखिरी दर्जे पर नज़र आता है। इंसान इंसान है और खुदा खुदा है इस हकीकत को जानना ही सच्चा इल्म है और यह घटना इस सच्चे इल्म की आखिरी शानदार मिसाल है।

निस्स्वार्थता

अब्दुल्लाह बिन अब्बास (रज़ि०) बयान करते हैं: अबूबक्र (रज़ि०) के ज़माने में अकाल पड़ा और लोग सख्त परेशान हो गए। अबूबक्र (रज़ि०) ने कहा, “तुम लोग न घबराओ, अल्लाह जल्द ही तुम्हारे लिए खुशहाली पैदा कर देगा।” इसके बाद ऐसा हुआ कि उस्मान (रज़ि०) का व्यापारिक क्राफ़िला सीरिया से आया। इसमें एक हज़ार ऊंट थे और सब के सब गेहूं और अन्य खाने की चीज़ों से लदे हुए थे। यह ख़बर मदीने में फैली तो शहर के व्यापारी उस्मान (रज़ि०) के घर पहुंचे। उन्होंने दरवाज़ा खटखटाया। वह बाहर आए। उनके पास एक चादर थी, जिसको वह अपने कंधे पर इस तरह डाले हुए थे कि उसका एक सिरा सामने की तरफ़ लटक रहा था और दूसरा सिरा पीछे की तरफ़।

उस्मान (रज़ि०) ने पूछा कि तुम लोग क्यों आए हो और मुझसे क्या चाहते हो? व्यापारियों ने कहा “हम को यह बात पता चली है कि आपके पास एक हज़ार ऊंट गेहूं और खाने का सामान आया है। हम आपको खरीदना चाहते हैं। आप हमें यह खाद्य सामग्री बेच दें, ताकि हम इसको मदीने के ज़रूरतमंदों तक पहुंचा सकें।”

उस्मान (रज़ि.) ने कहा कि अन्दर आओ और घर में बैठ कर बात करो। वे लोग घर में दाखिल हुए तो देखा कि खाद्य सामग्री के एक हज़ार ढेर घर के अन्दर पड़े हुए हैं।

अब बातचीत शुरू हुई। उस्मान (रज़ि०) ने कहा, “शाम (सीरिया) की मेरी इस ख़रीदारी पर तुम मुझको कितना ज़्यादा नफ़ा दोगे?” उन्होंने कहा, “दस दिरहम पर बारह दिरहम “उस्मान (रज़ि.) ने कहा, “मुझे इससे ज़्यादा कीमत मिल रही है।”

यज्दगर्द नाराज़ हुआ और बोला — "एक टोकरी मिट्टी लाओ और इसे उनके सबसे बड़े आदमी के सिर पर रख दो और इन्हें भगा दो।" उन्होंने मिट्टी आसिम बिन अम्र के सिर पर रख दी। वह इसे लेकर दरबार से निकले और ऊँटनी पर बैठकर अपने सेनापति सअद बिन अबी वक्रकास (रज़ि०) के पास पहुँचे। जब सअद (रज़ि०) को पता चला तो उन्होंने कहा:

"ख़ुश हो जाओ! ख़ुदा की क़सम, अल्लाह ने हमें इनके राज्य की चाबियाँ दे दी हैं। (यानि इसे उनकी ज़मीन जीतने की निशानी समझो)"
(अल-बिदाया व अल-निहाया, खंड 7, पृष्ठ. 42)।

एक ही मा'बूद

रसूलुल्लाह (सल्ल०) की वफ़ात 63 साल की उम्र में मदीने में हुई। उस समय लोगों में अजीब दीवानगी छा गई। बहुत से लोगों को यह विश्वास ही नहीं होता था कि आपका इन्तक़ाल हो सकता है या इन्तक़ाल हो गया। हज़रत उमर फ़ारूक़ इस दीवानगी में सबसे आगे थे। वह मदीने की मस्जिद नबवी में तलवार लेकर खड़े हो गए और कहने लगे कि जो शख्स कहेगा कि रसूलुल्लाह नहीं रहे मैं इस तलवार से उसकी गरदन उड़ा दूंगा।

मस्जिद नबवी में ज़बर्दस्त तनाव और सन्नाटा था लोग बहुत हठात् और परेशान नज़र आ रहे थे। इतने में हज़रत अबूबक्र वहां आए और उन्होंने इस स्थिति को भांपा और इसके बाद मस्जिद के एक तरफ़ भाषण करने को खड़े हो गए। अपने भाषण में उन्होंने यह ऐतिहासिक वाक्य कहा: "जो शख्स मुहम्मद की इबादत करता था तो मुहम्मद का देहांत हो गया; और जो शख्स अल्लाह की इबादत करता था तो अल्लाह जिन्दा है। उस पर कभी मौत आने वाली नहीं।" (सीरत इबन हिशाम, खण्ड 2, पृष्ठ 656)

में डालता है। पहली बार मिट्टी डालते हुए वह कहता है, "इसी से हमने तुम्हें पैदा किया" दूसरी बार मिट्टी डालते हुए वह कहता है, "और इसी में हम तुम्हें वापस भेजेंगे"; और तीसरी बार मिट्टी डालते हुए वह कहता है, "और इसी से हम तुम्हें फिर से बाहर निकालेंगे" (कुरआन, 20:55)। यह तीन बार मिट्टी डालना पूरे मामले का चरम बिंदु है। इस जीवित घटना के माध्यम से बताया जाता है कि इंसान क्या है और उसका अंतिम परिणाम क्या होगा।

बुरे बर्ताव से अच्छे नतीजे की उम्मीद करना

ईरानियों से जंग के वक्रत मुसलमानों का एक दल बादशाह यज़्दगर्द के दरबार में पहुँचा। यज़्दगर्द ने उनसे तिरस्कार से बातें कीं। उसने कहा — "मुझे नहीं लगता कि धरती पर तुमसे ज्यादा बदहाल और आपस में लड़ने वाली कोई क्रौम होगी। हम तुम्हें पास-पड़ोस के गाँवों के हवाले कर देंगे, वही तुम्हारे लिए काफ़ी होंगे।" मुसलमानों की तरफ़ से मुगीरा बिन शुअबा ने जवाब दिया — "तुमने हमारी हालत का जो जिक्र किया, वह बिल्कुल सही है। हमारे घर बस ज़मीन की सतह पर थे। हम ऊँट और बकरियों के बालों के कपड़े पहनते थे। हमारा हाल यह था कि हम आपस में क्रतल करते थे, नफ़रत रखते थे। कोई अपनी बेटी को जिंदा दफ़ना देता था कि कहीं वह उसके खाने में हिस्सादार न बन जाए। फिर अल्लाह ने हमारे पास एक शाख़्स को भेजा, जिसे हम जानते थे और जो हममें सबसे अच्छा था। उसने हमें एक अल्लाह की तरफ़ पुकारा। शुरू में बस एक इंसान (अबू बक्र रज़ि०) ने उसका साथ दिया। हम बाक़ी उसकी बातों को झुठलाते रहे।"

"लेकिन उसने जो कुछ कहा, वह सब सच निकला। फिर अल्लाह ने हमारे दिलों में उसकी सच्चाई बिठा दी और हम उसके मानने वाले बन गए।"

मौत का पाठ

मैं एक जनाजे में शामिल हुआ। मौत के बाद उस व्यक्ति का शरीर धोया गया। उसे नए कपड़े पहनाए गए, जनाजे की नमाज पढ़ी गई, और फिर शव को कंधों पर उठाकर कब्र तक ले जाया गया। जब शव को कब्र में सम्मानपूर्वक लिटा दिया गया, तो मैंने सोचा, इस मृत शरीर के साथ इस तरह का ध्यान और सम्मान क्यों दिया गया है? यह सत्य है कि मृत्यु के बाद इंसान का शरीर सिर्फ मिट्टी के अलावा कुछ नहीं होता, फिर भी उसे सामान्य मिट्टी की तरह इधर-उधर नहीं फेंका जाता, बल्कि उसके साथ एक इंसान जैसा व्यवहार किया जाता है।

"मिट्टी" के साथ "इंसान" जैसा व्यवहार करने का आदेश मृतक के लिए नहीं है, बल्कि जीवित रहने वालों के लिए है। मृतक के माध्यम से जीवित लोगों को यह पाठ दिया जाता है कि आखिरकार उनका परिणाम क्या होने वाला है। इस्लाम यह चाहता है कि जीवित लोग मृतक के रूप में स्वयं को देखें। वे मृत्यु से पहले मृत्यु का अनुभव करें। यह अनुभव इस प्रकार भी संभव था कि एक निर्धारित दिन कागज से एक मानव पुतला बनाया जाए और उसके साथ सभी रस्में निभाकर उसे मिट्टी के गड्ढे में डाल दिया जाए। लेकिन इस्लाम ने इस अनुभव को वास्तविक बनाने के लिए एक वास्तविक इंसान के मृत शरीर का उपयोग किया।

यह व्यक्ति हमारे जैसा एक जीवित इंसान था। चलते-चलते उसके कदम थम गए। बोलते-बोलते उसकी जुबान चुप हो गई। देखते-देखते उसकी आँखें बेनूर हो गईं। लोगों के लिए जिसकी जो क्रीमत् थी, वह अचानक खत्म हो गई। अब, खुदा इस घटना का उपयोग करता है ताकि एक इंसान के माध्यम से वह लोगों को जीवन का पाठ याद दिलाए। लोग उसे सम्मान से तैयार करते हैं, और फिर उसे कब्र तक ले जाते हैं। जब उसे कब्र के गड्ढे में लिटा दिया जाता है, तो हर आदमी यह करता है कि तीन बार अपनी हाथों में मिट्टी लेकर कब्र

